Phone : 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اپریل 1963ء

یادِ اقبالؒ

شائع کردہ:

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدل اشتراک	قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون نمبر ——— (۷۵۰۰)
پاکستان سے سالانہ ۸ روپے	ہند و پاکستان سے	خط و کتابت کا پتہ
خارج سالانہ ... ۱۶ شلنگ	۷۵ نئے پیسے	ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۶ — اپریل سنہ ۱۹۶۳ء — نمبر ۴

فہرستِ مضامین

۱۔ لمعات ——— ۲
سابقہ خاکساروں کو مخلصانہ مشورہ ——— ۷
۲۔ روٹی کا مسئلہ ——— (اقبالؒ کی نظر میں) ——— ۸
۳۔ نشانِ منزل ——— ۱۷
۴۔ مجلسِ اقبالؒ ——— ۲۱
۵۔ نشاۃ ثانیہ کا نقیب ——— (صفدر سلیمی) ——— ۳۱
۶۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ——— علامہ السید احمد الشیقی ——— ۳۴
(ترجمہ سید نصیر شاہ صاحب میانوالی)
۷۔ تعاون ——— (مولانا عبد الرب صاحب) ——— ۴۲
۸۔ رابطۂ باہمی ——— ۴۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

پچھلے دنوں کراچی میں موتمر عالم اسلامی کے زیر اہتمام ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں (کہا جاتا ہے کہ) مختلف اسلامی ممالک کے ممتاز مشاہیر شریک تھے۔ موضوع زیر بحث یہ تھا کہ اسلام کو ایک ضابطۂ حیات کے طور پر دنیا میں کس طرح عام کیا جائے تاکہ اس سے کمیونزم کے سیلاب کی روک تھام ہو سکے جو اسلام کے لئے اس وقت سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس سلسلے میں کہا گیا کہ یہ چیز بڑی حیرت انگیز ہے کہ کمیونزم جو ایک باطل نظریۂ زندگی اور غلط نظام ہے، بڑی تیزی سے فضائے عالم کو متاثر کئے جا رہا ہے اور اسلام جو سرتاسر حق پر مبنی نظام ہے اس تیزی سے نہیں پھیل رہا۔

اس وقت ہمارے پیش نظر نہ تو موتمر کی اس مجلس مذاکرہ پر کوئی تبصرہ ہے اور نہ ہی ـــــ اس کی کارروائی پر کسی قسم کی تنقید۔ ہمارے سامنے صرف یہ سوال ہے کہ کمیونزم کے مقابلہ میں اسلام ایک موثر حقیقت کے طور پر دنیا میں کیوں نہیں پھیل رہا۔ اس سوال تک آنے سے پہلے ہم ضمناً یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ کمیونزم واقعی اسلام کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے لیکن یہ کہنا اور سمجھنا غلط ہے۔ اسلام کے لئے خطرہ صرف کمیونزم ہے اور یورپ (اور امریکہ) کے نظریات حیات اور نظام زندگی اسلام کے لئے موجب خطرہ نہیں۔ دونوں کی ڈکٹیٹرشپ اور انتر آکیت ہو یا یورپ کی جمہوریت اور نظام سرمایہ داری، دونوں باطل اور اسلام کے لئے یکساں خطرہ کا موجب ہیں۔ یہ دونوں درحقیقت مغرب کے اس مادی تصور حیات کی شاخیں ہیں جسے علامہ اقبالؒ کی اصطلاح میں تہذیب فرنگ کہا جاتا ہے اور جو اسلام کی یکسر نقیض ہے۔ اس لئے ان دونوں میں سے ایک کو اسلام کے لئے خطرہ اور دوسرے کو اسلام کے لئے آئیڈیل سمجھنا حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ اسلام ایک منفرد تصور حیات اور نظام زندگی ہے اور دنیا کا ہر دوسرا تصور اور نظام اس کا حریف ہے۔

اب ہم اس اصل سوال کی طرف آتے ہیں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے یعنی یہ کیوں ہے کہ کمیونزم اتنی تیزی سے فضائے عالم کو متاثر کیا جا رہا ہے اور اسلام اس تیزی سے نہیں پھیل رہا۔ ہم سردست اس کی صرف ایک وجہ بیان کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک بنیادی ہے۔

یہ واضح ہے کہ جب "کمیونزم" کا لفظ زبان پر لایا جاتا ہے تو کہنے والے اور سننے والے دونوں کے نزدیک اس کا ایک متعین مفہوم ہوتا ہے۔ کہنے والا بھی جانتا ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور سننے والا بھی سمجھتا ہے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی ہو یا نظامِ حیات۔ اس کا معاشی پروگرام ہو یا انقلابی عزائم۔ ان کے متعلق کسی کے ذہن میں کوئی ابہام یا التباس نہیں ہوتا۔ ایک کمیونسٹ جنوبی امریکہ میں ہو یا قطبِ شمالی میں۔ دونوں کے ذہن میں ان تمام امور کے متعلق واضح تصور اور مبین نقشہ ہوتا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کمیونزم کسے کہتے ہیں اور کمیونسٹ کون ہوتا ہے لہٰذا جب وہ کمیونزم کو پیش کرتے ہیں تو پورے حتم و یقین کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور جو شخص کمیونزم کو قبول کرتا ہے اسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ میں کیا قبول کر رہا ہوں اور کس جماعت میں شامل ہو رہا ہوں۔ اس کے بعد میرا پروگرام کیا ہو گا اور اس پروگرام کا منتہیٰ و مطلوب کیا۔؟

اس کے برعکس جس چیز کو آج اسلام کہہ کر پیش کیا جاتا ہے ذرا دیکھئے کہ اس کی صورت کیا ہے۔ (اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ ہم جو کچھ اس وقت کہہ رہے ہیں یہ اس اسلام سے متعلق ہے جو اس وقت عام طور پر مروج ہے یا جسے بالعموم پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کچھ ہم حقیقی اسلام کے متعلق نہیں کہہ رہے) ہمارا خیال ہے کہ اس وقت دنیا میں جس کثرت سے اسلام، اسلامی تصوریات، اسلامی نظریۂ زندگی، اسلامی نظام، اسلامی اقدار، اسلامی عدلِ عمرانی، اسلامی مساوات، اسلامی جمہوریت وغیرہ الفاظ دہرائے جاتے ہیں اس کی مثال کہیں اور نہیں ملے گی۔ لیکن اس کے باوجود سوچئے کہ کیا ان الفاظ اور اصطلاحات کا کوئی متعین، واضح اور غیر مبہم مفہوم بھی کہیں پیش کیا جاتا ہے؟ آپ منبر پر کسی خطیب یا اسٹیج پر کسی مقرر کو سنئے۔ یہ الفاظ ہر مقام پر دہرائے جائیں گے کہ اسلام، سیاسی۔ تمدنی۔ عمرانی۔ معاشرتی۔ معاشی۔ دینی۔ دنیاوی۔ غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے میں اپنا مخصوص نظام رکھتا ہے جو نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل ہے۔ دنیا آج جس جہنم میں مبتلا ہے اس سے نجات کا واحد ذریعہ اسلام کا نظامِ زندگی ہے۔ یہ الفاظ تو آپ بچپن سے آج تک مسلسل اور متواتر سنتے آ رہے ہوں گے لیکن کیا آپ نے ایک بار بھی نہیں سنا ہو گا کہ بالآخر وہ نظام ہے کیا جس کا مثیل اور نظیر کوئی اور نظام نہیں اور جو دنیا کی تمام مشکلات کا واحد اور مکمل حل ہے۔ آپ تو ان الفاظ اور اصطلاحات کو عقیدت سے سن کر مطمئن ہو سکتے ہیں لیکن سوچئے کہ جب آپ انہیں غیر مسلموں کے سامنے دہرائیں اور ان کا کوئی متعین تصور اور نقشہ ان کے سامنے پیش نہ کریں تو ان پر اس کا کیا اثر ہو گا۔ اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی سامنے رکھئے کہ آپ ان سے کہیں تو یہ کہ ہمارے پاس ایسا نظامِ زندگی ہے جو تمام نوعِ انسان کی مشکلات کا مکمل حل اپنے اندر رکھتا ہے اور آپ کی حالت یہ ہو کہ آپ اپنی ہر مشکل کے حل کیلئے ان لوگوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں جو غیر اسلامی نظامِ زندگی کے حامل ہیں تو وہ آپ کے اور آپ کے پیش کردہ اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟ اور باتوں کو چھوڑیئے آپ نے پاکستان کا مطالبہ اس بنیاد پر کیا تھا کہ ہم ایک ایسی آزاد مملکت قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے کارفرما ہو۔ وہ مملکت آپ کو مل گئی۔ اس کے بعد دنیا کی آنکھیں آپ کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھیں وہ کون سا نظامِ زندگی ہے جسے یہ لوگ اپنے ہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ اور جس کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ وہ دنیا کی تمام مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ فرمایئے وہ کون سا نظام ہے جسے آپ نے قائم کر کے دکھایا؟ کہا جائے گا کہ نظام قائم کرنے میں وقت لگتا ہے۔ بہت اچھا! لیکن یہ فرمایئے کہ آپ نے اس نظام کا کوئی نقشہ یا خاکہ بھی متعین کیا جس سے یہ معلوم ہو سکتا کہ وہ نظام ہو گا کیسا؟ جس زمانے میں پہلا دستورِ پاکستان زیرِ تدوین تھا، آپ دنیا کے اس

اعتراض کے جواب میں کہ پاکستان میں دستور سازی کے سلسلے میں اس قدر تاخیر کیوں ہو رہی ہے، کہا کرتے تھے کہ اگر ہم نے بھی دوسری قوموں جیسا دستور بنانا ہوتا تو کبھی کا بنا دیا ہوتا۔ ہمیں اسلامی دستور مرتب کرنا ہے جس کی مثل اور نظیر کہیں نہیں۔ اس لئے اس میں وقت لگ جانا ناگزیر ہے۔ اس کے بعد آپ نے دستور مرتب کیا اور اسے "اسلامی" کہا بھی گیا ـــــ مذہبی حلقوں کی طرف سے بھی اسے اسلامی کہا گیا۔ آپ ذرا سوچئے کہ آپ نے جو کچھ دنیا کے سامنے پیش کیا وہ واقعی ایسا تھا جس کی مثل اور نظیر کہیں نہیں مل سکتی تھی اور جس میں تمام نوع انسان کی مشکلات کا حل پوشیدہ تھا ہم نے اس (۱۹۵۶ء کے) آئین کا خاص طور پر نام اس لئے لیا ہے کہ ہمارے مذہبی طبقہ نے اسے اسلامی قرار دیا تھا۔ ورنہ جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے کہ اسلامی آئین بے مثل و بے نظیر ہوگا اور اس میں نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل ملے گا وہ آئین اور موجودہ آئین ایک ہی سطح پر ہیں۔ اس زمانے میں ہمارے مذہبی طبقہ کی طرف سے آئین کے مسودات بھی پیش ہوئے تھے۔ آپ ذرا ان مسودات کا مطالعہ کیجئے اور پھر غور کیجئے کہ کیا وہ اس دعوے کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ اسلامی آئین تمام دنیا کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ پاکستان کو چھوڑئیے۔ کیا مسلمانوں کی مختلف مملکتوں میں سے کسی ایک میں بھی ایسا نظام رائج ہے ـــــ یا کسی نے ایسا نظام پیش کیا ہے جو ہمارے اس دعویٰ کا ثبوت پیش کرتا ہو جسے ہم صبح و شام دنیا کے سامنے دہراتے رہتے ہیں؟

" اسلامی نظام کا پیش کرنا تو بڑی بات ہے، یہاں حالت یہ ہے کہ سارے عالم اسلام میں کوئی ضابطۂ قوانین بھی ایسا نہیں پیش کیا جا سکتا جسے سب مسلمان اسلامی تسلیم کریں۔ اس باب میں ہماری حالت کیا ہے اس کا اندازہ ایک عملی مثال سے لگائیے۔ ہمارے پاکستان میں شور مچایا جا رہا ہے کہ عائلی قوانین جو حکومت کی طرف سے نافذ ہوئے ہیں غیر اسلامی ہیں انہیں منسوخ کیا جانا چاہیئے۔ یہ مطالبہ مذہبی طبقہ کی طرف سے بڑے شد و مد سے پیش کیا جا رہا ہے اور یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ اس مطالبہ میں تمام فرقوں کے مسلمان متفق ہیں۔ بہت اچھا! لیکن آپ یہ معلوم کر کے متعجب ہوں گے کہ اس مطالبہ کرنے والوں میں سے کسی ایک نے بھی عائلی قوانین کا کوئی متبادل مسودۂ قوانین ایسا پیش نہیں کیا جسے یہ سب فرقے "اسلامی" تسلیم کر لیں۔ چنانچہ نیشنل اسمبلی میں محترم عباس علی خاں کی طرف سے جو بل پیش ہو رہا ہے اس میں بھی صرف اتنا ہی کہا گیا ہے کہ موجودہ قوانین کو منسوخ کر دیا جائے۔ اگر یہ قوانین منسوخ ہو گئے تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ ملک میں پھر سے وہ قوانین رائج ہو جائیں گے جو انگریز کی حکومت میں نافذ تھے اور جو آج ـــــ مسٹر ڈنشا فریدون جی ملا (پارسی) کے مجموعۂ قوانین میں درج ہیں اور جو ہر فرقے کے لئے الگ الگ ہیں۔ یوں موجودہ "غیر اسلامی" عائلی قوانین کی جگہ "اسلامی" قوانین رائج ہو جائیں گے! یا للعجب! یہ اس لئے نہیں کہ ان حضرات نے متبادل مسودۂ قوانین مرتب کرنے کی طرف توجہ نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا مسودۂ قوانین مرتب کرنا "جو سب کے نزدیک اسلامی کہلا سکے" ان حضرات کے لئے ناممکن ہے اور یہ اس لئے کہ ہمارے ہاں "اسلام" کا کوئی متعین اور متفق علیہ مفہوم ہی نہیں۔ یہ بات ہم یونہی نہیں کہہ رہے یہ ایک امر واقعہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ موجودہ آئین پاکستان میں یہ شق رکھی گئی ہے کہ

پاکستان میں کوئی قانون ایسا نافذ نہیں ہوگا جو اسلام کے خلاف ہو۔

اگلے دنوں لاہور میں بار ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے، محترم مودودی صاحب نے کہا کہ یہ شق بڑی مبہم ہے۔

اس کے مطابق کوئی قانون مرتب ہی نہیں ہو سکے گا۔ یہ وجہ ہے کہ ہم مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس شق میں "اسلام کی جگہ" "کتاب و سنت" کے الفاظ رکھے جائیں۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اسلام کی اصطلاح اس وقت کس قدر مبہم اور اس کا مفہوم کیسا غیر متعین ہو چکا ہے (ہم اس وقت اس نکتہ کو چھیڑنا نہیں چاہتے کہ "کتاب و سنت" کی اصطلاح بھی اس سے کم مبہم اور غیر متعین نہیں۔ اور "کتاب و سنت" کی رُو سے ایسا ضابطہ قوانین مرتب کرنا بھی ناممکن ہے۔ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ طور پر اسلامی ہو۔

اب آپ "اسلامی نظام" یا "اسلامی قوانین" سے نیچے اتر کر "مسلمان" کی اصطلاح کو لیجئے۔ اس باب میں آپ کو یاد ہو گا کہ پاکستان کے مختلف فرقوں کے نمائندہ علماء حضرات میر کمیٹی کے سامنے شہادت دیتے وقت یہ نہیں بتا سکے تھے کہ "مسلمان" کسے کہتے ہیں۔ اگر کسی کو "میر کمیٹی" کے نام سے عہدہ آتا ہو تو یہ نام بھی نہ لیجئے۔ ان حضرات سے پوچھئے کہ وہ "مسلمان" کی کوئی ایسی تعریف (DEFINITION) بتا دیں جو تمام مسلمانوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں کر سکے گا۔ اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے دوسرے فرقوں نے کافر نہ قرار دیا ہو۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ سنئے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک ہندو مسلمان ہو گیا۔ وہ خوش تھا کہ اسے کفر سے نجات ملی۔ اور وہ اسلام سے مشرف ہوا۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ مسلمانوں کی مختلف مسجدوں میں جاتا رہا۔ اس نے دیکھا کہ وہ جن مولوی صاحب کے ہاتھ پر اسلام لایا تھا ان کے فرقے کے علاوہ، اور سب فرقوں کے علماء حضرات اسے کافر قرار دے رہے ہیں۔ وہ بیچارا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ جس کفر سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں مسلمان ہوا تھا جب وہ کفر اسی طرح میرے پیچھے لگا رہا تو مجھے آبائی مذہب چھوڑنے سے حاصل کیا ہوا؟ کہتے ہیں کہ وہ اس پر پھر ہندو ہو گیا۔ وہ ہندو ہو گیا یا نہ، لیکن کیا یہ واقعہ نہیں کہ ہم میں سے ہر مسلمان دوسرے فرقہ والوں کے نزدیک کافر ہے۔

جب حالات یہ ہوں تو آپ غور فرمائیے کہ کیا اس بات کے سمجھنے کے لئے کہ اسلام دنیا میں پھیل کیوں نہیں رہا اور فضائے عالم کو متاثر کیوں نہیں کر رہا کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت ہے؟ بات صاف اور واضح ہے۔ جب صورت یہ ہو کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں اس کا کوئی متعین مفہوم ہی آپ کے ذہن میں نہ ہو تو اس سے آپ کا مخاطب متاثر کیا ہو گا؟ اور وہ بات آگے چلے گی کس طرح؟ ہمارے ہاں اکثریت تو ان کی ہے جن کے ذہن میں اسلام کا کسی قسم کا تصور ہی نہیں۔ ان کے نزدیک اسلام نام ہے چند موروثی عقائد اور چند مروجہ رسوم کا۔ باقی رہے وہ جن کے ذہن میں اس کا کوئی تصور ہے تو وہ اس فرقے کا تصور ہے جس سے وہ وابستہ ہیں۔ عالمگیر اسلام کا تصور وہ بھی نہیں یہ بھی درحقیقت چند موروثی عقائد و رسوم کے مجموعہ ہی کا نام ہوتا ہے۔ اور چونکہ فرقے الگ الگ ہیں اس لئے اسلام کا تصور بھی الگ الگ ہے۔ اور ان فرقوں میں بھی کوئی ایسا نہیں جو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے اسلام کا کوئی تصور رکھتا ہو۔ حتیٰ کہ ان میں سے جو لوگ اسلامی نظام قائم کرنے کے مدعی ہیں انہوں نے بھی آج تک یہ نہیں بتایا کہ اسلامی نظام ہے کیا؟ وہ بھی اتنا ہی کہتے ہیں کہ حکومت کا اقتدار ہمارے سپرد کر دو تاکہ ہم اس میں اسلامی نظام قائم کر دیں۔

یہ صورت حالات، بظاہر بڑی مایوس کن ہے۔ لیکن یہ مرض لاعلاج نہیں۔ اس میں مایوسی اس وقت تک ہو سکتی ہے جب تک ہم اس کے علاج کے لئے آمادہ نہیں ہوتے۔ آیئے ہم دیکھیں کہ اس کا علاج ہے کیا؟

ہم میں سے ہر شخص یہ کہتا ہے (اور حقیقت بھی ہے) کہ اسلام اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں ہمارے قرنِ اول میں موجود تھا اب دیکھئے کہ اس قرنِ اول میں مسلمانوں کی زندگی کا نقشہ کیا تھا؟ وہ نقشہ یہ تھا کہ

(۱) تمام مسلمان ایک اُمت کے افراد تھے۔ ان میں نہ کوئی مذہبی فرقہ تھا نہ سیاسی پارٹی۔

(۲) ان میں مذہبی پیشوائیت کا کوئی وجود نہیں تھا۔

(۳) تمام اُمت کا ایک مرکز تھا جس کے فیصلے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ ہوتے تھے اور اسلامی قوانین کہلاتے تھے۔

(۴) تمام اُمت کا ایک ضابطۂ ہدایت تھا جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے۔ امت کا مرکز امت کو اس ضابطہ کے مطابق چلاتا تھا۔ اس ضابطہ میں اسلامی نظام کے اُصول وحدود واضح اور مبین طور پر موجود تھے (اور ہیں)۔

(۵) اس طرح یہ معاشرہ جس انداز پر متشکل تھا اسے اسلامی نہج زندگی کہا جاتا تھا۔ اس میں نہ کسی قسم کا ابہام تھا نہ الجھاؤ۔

یہ وہ حقائق ہیں جن سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا۔ آپ ان شقوں پر غور کیجئے اور پھر یہ دیکھئے کہ ان میں وہ کون سی چیز ہے جو آج بھی اُسی شکل میں باقی ہے جو قرنِ اول میں تھی۔ اس سوال کے جواب میں آپ ایک ہی نتیجہ پر پہنچیں گے، اور وہ یہ کہ ان میں صرف قرآن کریم اپنی اصلی صورت میں باقی ہے۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جسے آج بھی تمام مسلمان ــــ ہر فرقہ، ہر ملک اور ہر قوم کے مسلمان ــــ خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ لہٰذا امت کو پھر سے اسی قالب میں ڈھالنے کے لئے جس میں وہ قرنِ اول میں ڈھلی تھی اس کے سوا کوئی شکل نہیں کہ

قرآن کریم کو اسلامی نظام کی بنیاد، اور اسلامی اور غیر اسلامی کا معیار تسلیم کیا جائے۔

اس کے بعد، اگر مختلف اسلامی ممالک کی حکومتیں اس پر رضامند ہوں تو فبہا، ورنہ کوئی ایک مملکت (اور ہماری آرزو ہے کہ وہ مملکت، پاکستان کی ہو) ارباب فکر ونظر کی ایک مجلس متعین کرے، جو یہ متعین کرے کہ قرآن کی رُو سے، اسلامی نظام کی شکل کیا ہوگی۔ اسلامی نظام میں سیاسی، معاشرتی، معاشی وغیرہ تمام شعبے شامل ہیں۔ وہ مملکت اس نظام کو اپنے ہاں عملاً رائج کرے۔ اس نظام مملکت کی مرکزی اتھارٹی، امت کا مرکز قرار پائے جس کے فیصلے تمام افرادِ مملکت پر اسلامی قوانین کی حیثیت سے نافذ ہوں۔

اس طرح پھر سے اسلام کی وہی شکل دوبارہ قائم ہوسکے گی جو حالت قرنِ اول میں تھی۔ اس اسلام کو بچوں کی تعلیم کا نصاب بنایئے تاکہ آنے والی نسلیں شروع ہی سے اسلامی قالب میں ڈھلتی جائیں۔ یہ ہوگا وہ اسلام جو کمیونزم ہی کا نہیں بلکہ دنیا کے ہر باطل تصورِ حیات اور نظامِ زندگی کا مقابلہ کرے گا۔ یہ کیجئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ اسلامی تصورِ حیات زیادہ تیزی سے پھیلتا ہے یا کمیونزم!

اگر آپ ایسا نہیں کرسکتے تو یاد رکھئے! اسلام کے نام پر جس قدر تگ و دو اس وقت ہو رہی ہے یا اس کے بعد ہوگی، وہ کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کرسکے گی۔ آپ ایسے الفاظ دہرا کر، جن کا متعین اور متفق علیہ مفہوم آپ کے ذہن میں نہیں۔ دُ مخاطب کو متاثر کرسکتے ہیں نہ کوئی عملی نتیجہ پیدا کرسکتے ہیں۔ اس سے آپ صرف اپنے آپ کو یہ اطمینان دلا سکتے ہیں کہ آپ اسلام کی بڑی خدمت

کرلیتے ہیں۔

لیکن ایسا کرنے کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت ہوگی۔ اس لئے کہ اگر اسلام کا مفہوم متعین اور اس کا نظام قائم ہو جائے، تو اس سے ان لوگوں کے مفاد پر سخت زد پڑتی ہے جو یا تو مذہب کو ذریعہ معاش بنائے بیٹھے ہیں اور یا اسے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے بطور آلہ کار استعمال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی طرف سے اس اقدام کی سخت مخالفت ہوگی۔

اور اگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تو وہ کم از کم اتنی دیانت داری سے ہی کام لے کہ اسلام، اسلامی نظام، اسلامی مملکت، اسلامی عدل، اسلامی مساوات وغیرہ الفاظ استعمال نہ کرے۔ اس لئے کہ جن الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم ہی متعین نہیں انہیں بار بار دہرائے جانے سے حاصل کیا ہوگا؟ لیکن اس کے لئے بھی (دوسری قسم کی) ہمت درکار ہوگی۔ اس لئے کہ ان الفاظ کے دہرانے سے انسان عوام میں پاپولر ہو جاتا ہے اور عصرِ حاضر کی جمہوریت میں پاپولر ہونا بڑا ضروری ہے۔ اس کا آسان ترین طریق یہ ہے کہ عوام کے جذبات سے کھیلا جائے۔ اور اس مقصد کیلئے "مذہب" بڑا ہی موزوں میدان ہوتا ہے۔

اور اگر آپ کا خیال یہ ہے کہ اب نہ تو مسلمانوں کے فرقے مٹ سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں وحدت پیدا ہو سکتی ہے، نہ ایسے قوانین بنائے جا سکتے ہیں جن کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اور نہ ہی قرآن کی بنیادوں پر اسلامی نظام قائم کیا جا سکتا ہے تو پھر اسلام اور اسلامی نظام کی رٹ لگانا چھوڑ دیجئے۔ سیدھے طریق پر سیکولر نظام حکومت قائم کیجئے۔ جس میں پرسنل لاز (شخصی قوانین) مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں رہتے ہیں اور امورِ مملکت، حکومت کے حیطۂ اقتدار میں۔ ہمارا مذہبی طبقہ یہی چاہتا ہے۔ اس سے پاکستان کا بنیادی مقصد تو فوت ہو جائے گا لیکن قوم اس تذبذب سے تو نکل جائے گی جس میں وہ سولہ برس سے بُری طرح مبتلا ہے اور اس کی حالت یہ ہے کہ وہ کھونٹے میں کھنچی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی مقام پر گردش کئے جا رہی ہے اور اس کا ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھتا۔

سابق خاکساروں کو مشفقانہ مشورہ

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ بعض مقامات پر سابق خاکساروں کو قانون شکنی کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام کو (سابق) خاکساروں کی اولیں تحریک سے جس قدر ہمدردی رہی ہے اس کی بنا پر ہم انہیں مشفقانہ مشورہ دیں گے کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب پاکستان ہماری اپنی مملکت ہے۔ اس لئے یہاں کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیئے جس سے ملک میں انتشار پیدا ہو۔ اب ہمارا ہر قدم پُر امن اور تعمیری ہونا چاہیئے۔ والسلام۔

طلوعِ اسلام

روٹی کا مسئلہ

(اقبالؒ کی نظر میں)

اقبالؒ نے اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہا تھا کیونکہ قوموں کی زندگی میں امروز و فردا صدیوں کے پیمانے سے ماپے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس فردا کا طلوع کب ہوگا جب مسلمان اقبالؒ کے صحیح مقام اور اس کے پیغام کے صحیح مفہوم سے آشنا ہو سکیں گے لیکن یہ حقیقت تو ابھی سے بے نقاب ہونا شروع ہو گئی ہے کہ اقبالؒ "دیارِ غیر" کا شاعر تھا۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ انگلستان، فرانس، جرمنی اور اٹلی میں اقبالؒ کے کلام کے ترجمے شائع ہو رہے ہیں اور اس کی شرحیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن خود پاکستان میں یہ حالت ہے کہ سال بھر کے بعد اپریل کے مہینے میں دو چار مقامات پر انفرادی طور پر "یوم اقبال" کے جلسے منعقد کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد اس "دفترِ بے معنی" کو بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ دوران سال میں اتنا ہوتا ہے کہ کبھی کسی قوال نے اقبالؒ کی کوئی غزل گا دی یا کبھی ریڈیو والوں نے اپنے پروگرام کا خلا پُر کرنے کے لئے اس کی کوئی نظم سنا دی۔ یوں یاد قائم رکھی جا رہی ہے اس شخص کی جس نے (اور تمام باتوں کو چھوڑئیے) اس قوم کو اس پاکستان کا تصور دیا جس سے اب اس کی زندگی وابستہ ہے اور جس کی وجہ سے اسے وہ مواقع حاصل ہو گئے ہیں کہ اگر یہ چاہے تو دنیا کی سرفراز ترین قوموں کی صف میں جگہ پا سکتی ہے۔ اتنی بڑی احسان فراموشی مسلمانوں ہی سے ظہور میں آ سکتی تھی۔

ہمارے نزدیک اقبالؒ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قوم کو پھر سے قرآن سے آشنا کرانے میں مسلسل جدوجہد کی۔ اس میں شبہ نہیں کہ مملکتِ پاکستان بھی ایک گراں بہا نعمت ہے لیکن اقبالؒ کے الفاظ میں "مملکت ایک کوشش ہوتی ہے (قرآنی) نصب العینی اصولوں کو زمان و مکان میں صورت پذیر کرنے کی یہ ایک آرزو ہوتی ہے ان اصولوں کو کسی خاص انسانی ادارہ میں روبہ عمل لانے کی"۔ یعنی اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت کی اہمیت محض اس لئے ہوتی ہے کہ وہ انسانیت کے ان بلند

مقاصد کو جنھیں قرآن نے عطا کیا ہے عملی پیکروں میں ڈھالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ اقبالؒ کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے قرآن کے ان بلند مقاصد کو قوم کے سامنے بے نقاب کیا اور انھیں بتایا کہ ان کی زندگی اور سرفرازی کا راز انہی مقاصد کی عملی تشکیل میں ہے۔

اقبالؒ نے جو کچھ سمجھا، قرآن سے سمجھا، اور جو کچھ سمجھایا، قرآن سے سمجھایا۔ قرآن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی کے بلند مقاصد کو اصولی طور پر بیان کرتا ہے اور ان کی جزئیات کو بالعموم غیر معین چھوڑ دیتا ہے تاکہ قرآن پر عمل کرنے والی قوم ان جزئیات کو اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کی روشنی میں خود متعین کرتی جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس دور میں زندگی کا کوئی تقاضہ نمایاں حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس تقاضے سے متعلق قرآن کے اصول بھی نمایاں طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ ہمارے دور میں انسانی زندگی کے جس تقاضے نے سب سے زیادہ نمایاں حیثیت اختیار کی ہے۔ وہ روٹی کا مسئلہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جب سے انسان نے تمدنی زندگی شروع کی ہے۔ روٹی کا مسئلہ اس کے ساتھ ساتھ رہا ہے لیکن اس مسئلہ نے ایک عالمگیر تقاضے کی حیثیت ہمارے ہی دور میں اختیار کی ہے۔ یہ غیر ممکن تھا کہ اقبال جو زندگی کے تقاضوں پر قرآن کی روشنی میں غور کرتا تھا۔ اپنے دور کے ایسے اہم تقاضے سے غیر متاثر رہتا۔ اور قرآن نے اس باب میں جو راہنمائی دی ہے اسے پیش نہ کرتا۔ اقبال کا پہلا دور ان بڑھتے ہوئے تقاضوں سے متاثر ہونے کا ہے۔ دوسرا دور اس حل پر غور و فکر کرنے اور اسے قرآنی روشنی میں پرکھنے کا ہے۔ جو تنہا عقل انسانی نے اس مشکل کے لئے دریافت کیا۔ اور تیسرا دور وہ ہے جس میں اس نے اس مشکل کا قرآنی حل پیش کیا ہے۔ اس اثر پذیری کی آواز ہم سب سے پہلے "خضر راہ" میں سنتے ہیں۔ جب وہ خضر سے سوال کرتے ہیں کہ ؎

زندگی کا راز کیا ہے، سلطنت کیا چیز ہے؟　　اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

اور اس کے جواب میں خضر کہتا ہے ؎

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے　　خضر کا پیغام کیا ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر　　شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے　　مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس کے بعد پیامِ مشرق میں دیکھئے۔ وہ "صحبتِ رفتگاں" کے عنوان میں ٹالسٹائی، کارل مارکس، ہیگل، مزدک، کوہکن وغیرہ سب کو جمع کرتے ہیں اور ان کی زبان سے اس اہم تقاضے کی ترجمانی مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کرتے ہیں۔ ٹالسٹائی کہتا ہے ؎

بارکش اہرمن لشکری شہریار　　از پئے نانِ جویں تیغِ ستم برکشید
دارُوئے بیہوشیش تاجِ کلیسا و وطن　　جانِ خدا داد را خواجہ بجامے خرید

کارل مارکس کہتا ہے ؎

رازدانِ جزو و کل از خویش نامحرم شد است　　آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است

ہیگل اپنا فلسفہ اضداد پیش کرتا ہے، اور ٹالسٹائی اسے "عقلِ دو رو" کی چابک دستی قرار دے کر اس کی تردید کرتا ہے۔ مزدک اعلان کرتا ہے کہ ؎

دورِ پرویزی گذشت اے کشتۂ پرویز خیز　　نعمتِ گم کردۂ خود را ز خسرو باز گیر

فرانسیسی فلاسفر کومٹ مزدور کو یہ سبق دیتا ہے کہ ــــــ نیاید ز محمود کارِ ایاز ــــــ اور مزدور ایک پرمعنی تبسم سے جواب دیتا ہے کہ ؎

حقِ کوہکن دادی اے نکتہ سنج　　بہ پرویزِ پرکار و نابردہ رنج

آخر میں "قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور" میں وہ ان دونوں کا تقابل نہایت وضاحت اور خوبصورتی سے کرتا ہے جہاں سرمایہ دار مزدور سے کہتا ہے کہ ؎

غوغائے کارخانۂ آہنگری ز من　　گلبانگِ ارغنونِ کلیسا از آنِ تو
نخلے کہ شہ خراج برو می نہد ز من　　باغِ بہشت و سدرہ و طوبیٰ از آنِ تو
ایں خاک و آنچہ در شکمِ او از آنِ من　　وز خاک تا بہ عرشِ معلیٰ از آنِ تو

اور اس کے بعد "نوائے مزدور" میں کہتا ہے کہ ؎

بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز　　مئے کہ شیشہ گدازد بہ ساغر اندازیم
مغان و دیرِ مغاں را نظامِ تازہ دہیم　　بنائے میکدہ ہائے کہن بر اندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم　　بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم

یہی دعوتِ انقلاب ہے جسے ہم "زبورِ عجم" میں اس سے بھی تیز انداز میں دیکھتے ہیں جہاں اقبال کہتا ہے کہ ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب　　از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام　　آنچناں زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب

انقلاب

انقلاب، اے انقلاب

"بال جبریل" میں "فرشتوں کا گیت" اسی نظام سرمایہ پرستی کی تباہ انگیزیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ؎

خلق خدا کی گھات میں رند و فقیہ و میر و پیر — تیرے جہاں میں ہے وہی گردش صبح و شام ابھی
تیرے امیر مال مست، تیرے فقیر حال مست — بندہ ہے کوچہ گرد ابھی، خواجہ بلند بام ابھی

یہی وہ احتجاج ہے جس کے جواب میں خدا کی طرف سے فرشتوں کو حکم ملتا ہے کہ ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اسی کتاب میں لینن کی وہ مشہور درخواست بھی ہے جس میں وہ خدا سے کہتا ہے کہ ؎

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں — ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ — دنیا ہے تری منتظر روز مکافات

یہ ہیں نظام سرمایہ پرستی کے انسانیت سوز نتائج جنہیں اقبال کی نگہ بصیرت نے بھانپا اور جو اس کے قلب حساس کی گہرائیوں سے نشتروں کی شکل میں سطح سے اوپر ابھرے۔ یہی ہیں وہ اشعار جنہیں کمیونسٹ اپنے جلسوں اور جلوسوں میں گاتے ہیں اور ان سے ثابت کرتے ہیں کہ اقبال بھی کمیونسٹ تھا۔ لیکن اقبال کمیونسٹ نہیں تھا، نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کمیونزم کے دو حصے ہیں۔ ایک تو ان کا یہ دعویٰ کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ رزق کو سمیٹ کر اپنے قبضہ میں رکھ لے جبکہ غریب اور اس کے بچے بھوکوں مر رہے ہوں۔ جہاں تک اس دعویٰ کا تعلق ہے اس کا ہر وہ مسلمان ہمنوا ہے جو قرآن سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اقبال بھی اس کا ہمنوا تھا، اسے اس کا ہمنوا ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن دوسری چیز ہے کمیونزم کا وہ فلسفہ جس پر اس دعوے کی بنیاد رکھتے ہیں یعنی ہیگل کی جدلیت اور کارل مارکس کی تاریخ کی معاشی تعبیر۔ یہ وہ فلسفہ ہے جس کی تائید کوئی مسلمان نہیں کر سکتا اور چونکہ اقبال مسلمان تھا اس لئے وہ اس فلسفہ کا سخت مخالف تھا۔ چنانچہ وہ خواجہ غلام السیدین کے نام سے اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں (جو ۱۹۳۶ء میں لکھا گیا تھا) کہ:

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت اور مذہب کے مخالف ہیں، اور اسے افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ میں مسلمان ہوں اور انشاءاللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا میں قائل ہوں مگر روحانیت کے سیاسی مفہوم کا...... جو روحانیت میرے نزدیک منصب ہے۔ یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید میں نے جا بجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک

قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آجتک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ اقبال کارل مارکس کو "کلیم" تو کہتا ہے لیکن بے تجلی، وہ "مسیح" قرار دیتا ہے لیکن بے صلیب۔ حتیٰ کہ وہ جاوید نامہ میں افغانیؒ کی زبان سے یہ کہلاتا ہے ؎

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل — یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است — قلبِ او مومن دماغش کافر است
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
دینِ آں پیغمبرِ ناحق شناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس

وہ کہتا ہے کہ جب روٹی کے مسئلہ کو خاص مادی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کی جائے تو اس سے انسان حیوانی سطح پر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن اس کی انسانیت یکسر مردہ ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس قسم کی اشتراکیت ہو یا مغرب کی ملوکیت، انسانیت کے حق میں دونوں کا نتیجہ ایک ہے ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل — ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن

یہی "سوختن با ساختن" ہے جسے اقبالؔ "لا" اور "اِلّا" سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ روس کا اشتراکی نظام درحقیقت "لا" کے گرداب میں پھنسا ہوا ہے۔ اس کی تمام کوششیں تخریبی ہی تخریبی ہیں۔ وہ "ساختن" یعنی "اِلّا" (تعمیر) کی طرف نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ وہ "پس چہ باید کرد" میں روس کی اسی کش مکش کے بارے میں کہتا ہے ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں — از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است — تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ — لا سلاطین لا کلیسا لا اِلٰہ
فکرِ او در تندبادِ لا بماند — مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

یہاں سے وہ تیسرا دور شروع ہوتا ہے جہاں اقبال اس اہم تقاضے کے متعلق قرآنی حل کو پیش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے "سوختن اور ساختن" کے اصول کو لیتا ہے اور کہتا ہے کہ ؎

نکتہ می گویم از مردانِ حال	امتاں را "لا" جلال "الا" جمال
لا و الا احتسابِ کائنات	لا و الا فتحِ بابِ کائنات
ہر دو تقدیرِ جہانِ کاف و نون	حرکت از لا زاید از الا سکون
در مقامِ لا نیاساید حیات	سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا ساز و برگِ امتاں	نفی بے اثبات مرگِ امتاں

لا کے معنی ہیں ہر غلط نظام کو تباہ کر دینا۔ اور الا کے معنی ہیں اس کی جگہ ایک صحیح نظام کو قائم کرنا۔ صحیح نظام صرف مستقل اقدار کی بنیادوں پر قائم کیا جا سکتا ہے اور مستقل اقدار تنہا عقل کی رو سے کبھی نہیں مل سکتیں۔ یہ اقدار صرف وحی کی رو سے مل سکتی ہیں۔ اس لئے کہ ؎

عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر	سودِ خود بیند، نہ بیند سودِ غیر
وحیِ حق بینندۂ سودِ ہمہ	در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ

اسی لئے اقبال نے افغانیؒ کی زبانی (جاوید نامہ میں) روس کو یہ پیغام دیا تھا کہ ؎

تو کہ طرحِ دیگرے انداختی	دل ز دستورِ کہن پرداختی
کردہ کارِ خداوندان تمام	بگذر از لا جانبِ الا خرام
در گذر از لا اگر جویندۂ	تا رہِ اثبات گیری زندۂ
اے کہ می خواہی نظامِ عالمے	جستۂ او را اساسِ محکمے؟

اقبالؒ کے نزدیک نظامِ عالم کے لئے اس قسم کی محکم اساس قرآن کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے اس نے روس سے کہا کہ ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب	فکر را روشن کن از امّ الکتاب

اس کے بعد وہ کہتا ہے ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ	دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو	لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا
با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ	ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

اقبال کو خالی تخریبی پروگرام کی ناکامی پر اس قدر یقین تھا کہ وہ سمجھتا تھا کہ روس زیادہ دیر تک تخریب کے گرداب میں رہ نہیں سکتا۔ چنانچہ اس نے اپنی مثنوی "پس چہ باید کرد" میں یہاں تک کہہ دیا کہ ؎

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں   خویش را زیں تند باد آرد بروں

چنانچہ اقبالؒ اپنے ایک خط میں جو انھوں نے سر فرانسس ینگ ہزبنڈ کو ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا اور جو اسی جولائی کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا، لکھتے ہیں:۔

"ذاتی طور پر میں نہیں سمجھتا کہ روسی فطرۃً لامذہب ہیں۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ روسی عورتیں اور مرد بڑے مذہبی رجحانات رکھتے ہیں، اور روسی ذہن کا موجودہ منفی رجحان ہمیشہ باقی نہیں رہے گا کیونکہ کوئی عمرانی نظام دہریت کی اساس پر باقی نہیں رہ سکتا۔ جونہی اس ملک میں حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔ اور اس کے باشندوں کو اطمینان سے غور کرنے کا وقت ملے گا۔ وہ مجبوراً اپنے نظام کی کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ چونکہ بالشویزم کے ساتھ خدا کا قائل ہونا اور اسلام قریب قریب ایک ہی چیز ہیں۔ اس لئے مجھے ذرا بھی تعجب نہ ہوگا۔ اگر کچھ زمانے کے بعد روس اسلام کو ہضم کرلے یا اسلام روس کو"

لیکن اقبالؒ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو ہمیشہ اسی انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ یورپ کا فلاں ملک مسلمان ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے اور ہماری بھی قسمت جاگ اُٹھے۔ وہ مسلمانوں سے ہمیشہ یہی کہتا تھا کہ تمہاری قسمت تمہارے اپنے ہاتھوں ہی سے بیدار ہوگی۔ لہٰذا اس نے مسلمانوں سے کہا۔ کہ اس وقت زمانہ کے تقاضوں سے جو معاشی کشمکش پیدا ہو رہی ہے، تم اس کی روشنی میں قرآن پر غور کرو۔ اس سے تمہیں قرآن ایسی راہنمائی دیدے گا جس سے نہ صرف یہ کہ تمہاری قسمت بیدار ہو جائے گی بلکہ تمام اقوامِ عالم کی قیادت تمہارے حصہ میں آجائے گی چنانچہ وہ ضربِ کلیم میں کہتے ہیں کہ

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم   بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور   فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر   کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں   اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قُلِ العفو میں پوشیدہ ہے اب تک   اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

چنانچہ جب خود اقبالؒ نے زمانہ کے ان تقاضوں کی روشنی میں قرآن میں غور کیا تو اس کے سامنے یہ حقیقت آگئی کہ قرآن کی رو سے رزق کے فطری سرچشموں پر کسی کی انفرادی ملکیت کا تصور یکسر باطل ہے۔ خدا نے رب العالمین نے سامانِ رزق کو تمام نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر رکھا ہے۔ اس لئے اسے اس مقصد کے لئے عام ہی رہنا چاہیئے۔ رزق کے سرچشمے زمین سے پھوٹتے ہیں۔ اس لئے زمین کے متعلق اقبالؒ صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ "الارض للہ" ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
رزق خود را از زمیں بردن رواست — ایں متاعِ بندۂ و ملکِ خداست
آب و نان ماست از یک مائدہ — دودۂ آدم "کنفسٍ واحدہ"

بالِ جبریل میں قرآن کی اس حقیقت کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے، جہاں لکھا گیا ہے کہ ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے، کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں — تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں، میری نہیں!

اقبال، پاکستان کا حصول بھی اسی مقصد کے لئے چاہتے تھے کہ یہاں خدا کے اس قانون کو رائج کیا جا سکے، چنانچہ انہوں نے اپنی وفات سے صرف ایک سال پہلے قائداعظم کو ایک خط لکھا کہ:

"روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گزشتہ دو سو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی چلی جا رہی ہے..... لیگ کا مستقبل اس امر پر موقوف ہے کہ وہ مسلمانوں کو افلاس سے نجات دلانے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر لیگ کی طرف سے مسلمانوں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے کی کوئی کوشش نہ کی گئی تو مسلمان پہلے کی طرح اب بھی لیگ سے بے تعلق ہی رہیں گے....... شریعتِ اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے..... اسلام کے لئے سوشل ڈیموکریسی کی کسی موزوں شکل میں ترویج جب اسے شریعت کی تائید و موافقت حاصل ہو حقیقت میں کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا...... ان مسائل کے حل کے لئے ملک کی تقسیم کے ذریعہ ایک یا زائد اسلامی ریاستوں کا قیام اشد لازمی ہے۔"

یعنی اقبال کے نزدیک ایک الگ اسلامی مملکت کی ضرورت ہی اس لئے تھی کہ یہاں اسلامک سوشلزم کا نفاذ کیا جا سکے۔ جیسا کہ اقبال کو خود اندیشہ تھا، لیگ نے اس باب میں کچھ نہ کیا جس کا نتیجہ لیگ اور اس کے ساتھ سارا ملک بھگت رہا ہے۔

طلوعِ اسلام قرآن کی اس انقلابی طاقت کو جسے اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں پیش کیا تھا، آگے بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ مفاد پرستانہ جاہلیت کی طرف سے قرآن کی اس آواز کو دبانے کے لئے جو کچھ کیا جا رہا ہے، اس سے کون واقف نہیں۔ وہ سادہ لوح مسلمانوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتا ہے کہ جس قرآنی نظام کی طرف "طلوعِ اسلام" دعوت دیتا ہے، وہ ایک بڑا فتنہ ہے کہ جس کا کچل دینا بہت بڑے ثواب کا کام ہے۔ وہ زمینداروں، جاگیرداروں اور سرمایہ پرستوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ تمہارے لئے گھبرانے کی بات نہیں۔

"اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی مقدار اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت، جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں، بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔ ...... اسلام کے حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عائد کر سکتے ہیں اور نہ ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے جائز دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کرنے والی ہوں۔ ...... جس طرح وہ ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنا روپیہ، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو، اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔" (مسئلہ ملکیت زمین از ابوالاعلیٰ صاحب مودودی صفحہ ۵۲، ۶۲)

ہمیں خطرہ صرف یہ ہے کہ اگر اس وقت مسلمانوں نے قرآن کے ان حقائق کو اپنے معاشرہ کی بنیادیں قرار نہ دیا تو کمیونزم کا طوفانِ بدتمیزی نہ معلوم انہیں کہاں سے کہاں لے جائے۔ اس کے نتائج بعض مسلم ممالک میں سامنے آ چکے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ خطرہ کیا شکل اختیار کر سکتا ہے، اس کی بابت بہتر ہو کہ اقبال ہی کے الفاظ میں سنیئے، جو کہا گیا ہے ؎

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است　　ساز قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
حق اگر از پیش ما برداردش　　پیش قومے دیگرے بگذاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن　　ہر زماں جانم بلرزد در بدن
ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتش خود بر دل دیگر زنند

کس قدر دور رس تھیں اس مردِ حق آگاہ کی نگاہیں اور کیسا دردمند تھا اس مردِ مومن کا قلب! اس کتنی محبت تھی اسے انسان اور مسلمان سے، اور کیسا عشق تھا اسے خدا کے کلام سے۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

نشانِ منزل

(اقبال کی یاد میں ہفت روزہ طلوعِ اسلام بابت ۲۳ اپریل ۱۹۵۵ء کا اداریہ جسے
اس کی افادیت کے پیشِ نظر دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے)

سفر اور آوارگی، دونوں میں انسان کے قدم اٹھتے ہیں۔ وہ راستہ طے کرتا ہے، اس کا وقت اور توانائی صرف ہوتی ہے۔ اس کے کام کاج کا ہرج ہوتا ہے لیکن سفر کی ہر شخص تعریف کرتا اور اسے ضروری قرار دیتا ہے لیکن آوارگی انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ سفر اور آوارگی میں فرق کیا ہے؟ ان میں فرق صرف اس قدر ہے کہ سفر میں چلنے والے کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے اور اس کا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ اس کے برعکس آوارگی میں چلنے والے کے سامنے کوئی منزل متعین نہیں ہوتی۔ اس کا قدم کسی خاص سمت کی طرف نہیں اٹھتا۔ وہ یونہی کبھی ادھر کو ہو لیتا ہے کبھی ادھر کو۔ اسی طرح وہ دن بھر چلتا رہتا ہے۔ اپنے کام کاج کا ہرج کرتا رہتا ہے۔ وقت اور قوت صرف کرتا ہے لیکن اسے حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا آوارگی کے معنی ہیں سفر بلا تعیینِ منزل۔

یوں تو جس زمانہ سے ان کی مرکزیت فنا ہوئی، تمام دنیا کے مسلمان فکر و نظر کی آوارگی میں مبتلا چلے آ رہے تھے لیکن بیسویں صدی کے ربع اول میں، ہندوستان میں یہ بگولے کا رقص اپنی انتہائی شدت تک پہنچ گیا تھا۔ دیکھنے والے دیکھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کس طرح برق و باد آغوش کسی موہوم مقصد کے حصول کے لئے ہمہ تن اضطراب بن رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سینے میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں جو انہیں کسی وقت چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کچھ کانٹے ہیں جو ان کے تلووں میں بری طرح چبھ گئے ہیں اور وہ ان کے پاؤں کو کسی ایک جگہ ٹکنے نہیں دیتے۔ ایک حرکتِ پیہم اور سعیٔ مسلسل ہے جس نے اس قوم کو یکسر سیماب پا بنا رکھا ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ قوم مصروفِ جد و جہد تھی لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ اس جد و جہد کا مقصود کیا ہے۔ ان کے قدم اٹھتے تھے لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ جا کدھر کو رہے ہیں۔

غیر تو ایک طرف خود چلنے والوں کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ ہم کیوں چل رہے ہیں اور ہم نے جانا کہاں ہے؟ قوم تنہا نہیں چل رہی تھی، راہ نماؤں کے ساتھ جا رہی تھی۔ ان راہ نماؤں کے ساتھ جن کے خلوص میں شبہ نہیں تھا لیکن خود ان راہ نماؤں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہم نے کدھر جانا ہے اور قوم کو کہاں لے جانا ہے۔

قوم اس سفرِ بے منزل میں مصروفِ جادہ پیمائی تھی، لیکن ایک سادہ سا انسان تھا جو ان سب سے الگ ہٹ کر ایک گوشے میں بیٹھا، ایک کتاب کو سامنے رکھے پوری خاموشی سے کسی گہری سوچ میں ڈوبا نظر آتا تھا۔ قوم کے تیز خرام اسے آوازوں پر آوازیں دیتے، وہ ان کی طرف غم آلود نگاہوں سے دیکھتا اور پھر اسی کتاب کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا۔ شعلہ پیکر راہ نمایانِ قوم بے عملی کا طعنہ دے کر اسے اس کی فکرگاہ سے باہر کھینچنے کی کوشش کرتے لیکن ان کے یہ کچوکے بھی ناکام رہتے۔ بڑی سے بڑی جاذبیت اور سخت سے سخت ہنگامے بھی اس کی نگاہوں کو ایک ثانیہ کے لئے اس کتابِ عظیم کے صفحات سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکتے۔ وہ اسی طرح دریا کے طلاطم خیز اضطراب میں، سکوت و سکونِ گہر کے ساتھ اپنی خلوت گاہ میں محوِ تفکر رہا۔ تا آنکہ ۱۹۳۰ء کی ایک شام وہ وہاں سے باہر نکلا اور ان راہ نوردانِ شوق کو الٰہ آباد کے مقام پر اکٹھا کر کے انہیں بتایا کہ تمہارا یہ سفر، سفر نہیں آوارگی ہے۔ اور یہ آوارگی ہی رہے گا جب تک تم اپنی منزل کا تعین نہ کر لو۔ تمہاری منزل یہ ہے کہ تم ایک خطۂ زمین حاصل کرو جس میں تم اس کتابِ عظیم کے بتلائے ہوئے نقشے کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکو۔ اس نے کہا کہ اگر یہ مقصد تمہارے سامنے نہیں تو تمہاری تمام جدوجہد بے سود اور تمام سعی و کاوش لاحاصل ہے۔ بے سود اور لاحاصل ہی نہیں بلکہ سخت نقصان دہ اور ہلاکت انگیز ہے۔

پاکستان اس خطۂ زمین کا نام ہے جو اس مردِ درویش کے دیئے ہوئے تصور کے مطابق اس مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے حاصل کیا گیا۔ یہ قوم کی انتہائی خوش بختی تھی کہ عین اس وقت جب وہ اپنی بے پناہ "آوارگی" سے ہار تھک کر بیٹھ جانے کے قریب پہنچ چکی تھی، اسے اقبال جیسا دانائے راہ مل گیا جس نے اپنی بصیرتِ قرآنی سے ان کے لئے ایسی درخشندہ و تابناک منزل کا تعین کر دیا۔ لیکن اس کے بعد اس قوم کی یہ انتہائی بدقسمتی تھی کہ جب اسے وہ خطۂ زمین حاصل ہوا تو اقبال ان سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ قوم پھر آوارگیٔ فکر و نظر کا شکار ہو گئی۔ پاکستان کی گذشتہ زندگی، اسی فکری تشتت اور انتشار کی عبرت انگیز اور رسوا کن داستان ہے۔

اقبال نے اس راہ گم کردہ قوم کے لئے صرف منزل کی نشان دہی ہی نہیں کی تھی۔ اس نے اس نقشے کے کچھ خط و خال بھی متعین کر دیئے تھے جس کے مطابق اس خطۂ زمین میں ایک قرآنی معاشرہ کو متشکل ہونا تھا۔ حسین احمد صاحب مدنی کی نزاع کے سلسلہ میں اپنے زندہ جاوید جواب میں لکھتے ہیں:۔

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں کا خونریزیوں کا اور

خانہ جنگیوں کا۔ کیا ان حالات میں عالمِ بشری میں ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مؤسس ہو؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے، بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسبِ منشاء الٰہی مشہود کرنا انسان کا نصب العین قرار پائے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن و سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے، تو سوائے نظامِ اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے، اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالمِ بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے ۔۔۔۔۔۔
نبوتِ محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

اسی طرح وہ ڈاکٹر نکلسن کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:۔

اسلام بلکہ کائناتِ انسانیہ کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے اور جو لوگ نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس اختراع کے خلاف علمِ جہاد بلند کریں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے دنیائے اسلام میں استیلا کر رہا ہے اور مسلمان عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظر انداز کر کے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقید رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لئے میں ایک مسلمان اور ہمدردِ نوعِ انسانی کی حیثیت سے انہیں یاد دلانا مناسب سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فرض سارے بنی آدم کی نشو و ارتقا ہے۔

چونکہ اقبال کے تصور کے مطابق پاکستان کو اس مقصدِ عظیم کا اولین گہوارہ بننا تھا، اس لئے ظاہر ہے کہ بنی آدم کے نشو و نما کے سلسلہ کا آغاز بھی خود یہیں سے ہونا تھا۔ اس ضمن میں وہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے نام ایک مکتوبِ گرامی میں (جو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں لکھا گیا تھا)، رقمطراز ہیں:۔

اس وقت حالت یہ ہے کہ آئینِ جدید (۱۹۳۵ء کے ایکٹ) کے مطابق، اعلیٰ ملازمتیں امراء کے حصہ میں آجائیں گی اور نچلی ملازمتیں وزراء کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے وقف ہو جائیں گی۔

(عوام اور متوسط درجے کے مسلمانوں کا ان میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اسی طرح) دیگر معاملات میں بھی ہمارے سیاسی لیڈروں نے کبھی عوام کی مرفہ الحالی کے متعلق کچھ نہیں سوچا۔ روٹی کا مسئلہ دن بدن نازک ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہا ہے کہ وہ گزشتہ دو سال سے نیچے ہی نیچے جا رہا ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کا کیا علاج ہو..... ہماری خوش قسمتی ہے کہ اسلامی آئین کے پاس اس کا حل موجود ہے۔ اس آئین کو دورِ حاضرہ کے تصورات کی روشنی میں مزید نشوونما دی جا سکتی ہے۔ اسلامی آئین کے طویل اور گہرے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کر دیا جائے تو اس سے کم از کم ہر فرد کو سامانِ پرورش ضرور مل جاتا ہے۔ اگر ہندوؤں نے اشتراکی جمہوریت (SOCIAL DEMOCRACY) کو اپنے ہاں قبول کر لیا تو ہندو دست کا خاتمہ ہو جائے گا لیکن اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو ایسے مناسب انداز سے قبول کر لینا جس سے یہ اس کے اصولوں سے ٹکرائے نہیں، اسلام میں کسی تبدیلی کے مرادف نہیں بلکہ اس سے مفہوم یہ ہوگا کہ ہم اسلام کو پھر سے منزہ صورت میں اختیار کر رہے ہیں، جیسا کہ وہ شروع میں تھا۔

جہاں تک پاکستان میں اسلامی قوانین کی تدوین کا تعلق ہے، وہ تسلیم صاحب کے نام اپنے ایک خط میں (جو ستمبر ۱۹۲۵ء میں لکھا گیا تھا) رقمطراز ہیں:۔

میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جو رس پروڈنس یعنی اصولِ فقہ پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور نوعِ انسانی کا سب سے بڑا خادم بھی وہی ہوگا..... زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبع سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔

یہ ہیں وہ موٹے موٹے خطوط جو اقبال نے اس نقشے کے لئے اپنی تحریروں میں چھوڑے ہیں۔ ان سے وہ نقشہ آسانی سے مرتب ہو سکتا ہے جس کے مطابق پاکستان میں اس قرآنی معاشرہ کی تشکیل ہو سکتی ہے جس کے لئے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن اگر اقبال ان خطوط کو ہمارے لئے نہ بھی چھوڑ جاتا۔ یا انہیں ہم ناتمام پائیں، تو بھی کوئی ہرج نہیں۔ خدائے حکیم کی وہ کتاب زندہ جس پر غور و فکر سے اقبال نے ان تصورات کو اخذ کیا تھا خود ہمارے پاس موجود ہے۔ اس پر غور و فکر سے ہم پورے کے پورے نقشے کو مرتب کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے یہ کچھ کر لیا تو پھر وہ مقصد حاصل ہو جائیگا جس کے لئے اقبال نے اس خطۂ زمین کے حصول کی تلقین کی تھی۔

مجلسِ اقبال

مثنوی: پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق (قسط ۶)

سابقہ اشاعت میں یہ بتایا گیا تھا کہ دین کی اساس کس طرح لاالٰہ ۔ الا اللہ پر ہے۔ یعنی اس امر کی نفی کر دینا ہیں کوئی قوت ایسی ہے جس کے سامنے جھکا جائے اور اس کے ساتھ ہی اس حقیقت کا اثبات کہ ایسی ایک اور صرف ایک قوت ہے یعنی ذاتِ باری تعالیٰ۔ اطاعت اور محکومیت صرف اسی کے قوانین کی جائز ہے۔ جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ فرد کی ذات کی نشوونما ہو سکتی ہے اور نہ ہی امنِ عالم قائم رہ سکتا ہے۔ اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے بتایا ہے کہ چودہ سو سال پہلے کس طرح عرب کی صحرانشین قوم نے اس تعلیم کو اپنایا اور عام کیا اور اس کا نتیجہ کیا مرتب ہوا۔

با تو می گویم ز ایامِ عرب ۔۔۔ تا بدانی پختہ و خامِ عرب

ریزہ ریزہ از ضربِ او لات و منات ۔۔۔ در جہان آزاد از بند جہات

جب اس قوم نے اس بنیادی اصول (لاالٰہ ۔ الا اللہ) کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا تو اس سے ایک انقلابِ عظیم برپا ہو گیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اپنے ان معبودانِ باطل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جن کے سامنے ان کی گردنیں صدیوں سے جھکی چلی آ رہی تھیں۔ اس سے ان کی نگاہوں میں اس قدر وسعت اور ان کی گردنوں میں ایسا تراز پیدا ہو گیا کہ ان کی زندگی اس عالمِ محدود میں رہتے ہوئے، حدود فراموش اور جہت نا آشنا ہو گئی۔

ہر قبائے کہنہ چاک از دستِ او ۔۔۔ قیصر و کسریٰ ہلاک از دستِ او

انہوں نے ان تمام غلط تصورات کو، جو ان کے ہاں صدیوں سے متوارث چلے آ رہے تھے، مٹا دیا اور ایران و روم کی ملوکیت اور اس کے ساتھ ہی وہاں کی انسانیت سوز تہذیب کو ملیامیٹ کر دیا تاکہ مظلوم و مقہور انسان آزادی کا سانس لے سکے۔

گاہ دشت از برق و بارانش بدرد　　　گاہ بحر از زورِ طوفانش بدرد

وہ صحرائے عرب سے اٹھے اور دیکھتے ہی دیکھتے دنیا کے بحر و بر پر چھا گئے اور اس طرح انہوں نے ہر نظامِ کہنہ کو تہ و بالا کر دیا۔

عالمے در آتش او مثلِ خس　　　این ہمہ ہنگامہ لا بود و بس

انہوں نے جہاں جہاں غلط نظریاتِ زندگی اور باطل نظام ہائے حیات کو دیکھا انہیں جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا — یہ سب کیا تھا؟ اسی لا الٰہ پر ایمان کا نتیجہ! باطل کے ہر نظام کو مٹا دینا لا الٰہ پر ایمان کا فطری نتیجہ ہے۔ یہ حصہ تخریب ہے۔

اندرین دیر کہن پیہم تپید　　　تا جہانے تازہ آمد پدید

لیکن ان کا پروگرام صرف تخریبی نہیں تھا۔ یہ تمام تخریب اس تعمیر کا پیش خیمہ تھی جو ان کی مطلوب و مقصود تھی۔ انہوں نے ان غلط بنیادوں کو اکھیڑا تاکہ ان کی جگہ صحیح نظامِ زندگی کی نئی عمارت استوار کی جائے۔ چنانچہ یہ عمارت استوار ہوئی اور اس طرح ایک نئی دنیا وجود میں آ گئی۔

بانگِ حق از صبح خیز یہائے اوست　　　ہر چہ ہست از تخم ریز یہائے اوست

یہ انہی کی بیداری کا نتیجہ تھا کہ دنیا میں حق کا آوازہ بلند ہوا۔ اس جہانِ رنگ و بو میں جہاں جہاں آپ کو گل ہائے تازہ نظر آتے ہیں سب انہی کی تخم ریزی کا ثمرہ ہے۔

اینکہ شمعِ لالہ روشن کردہ اند　　　از کنارِ جوئے او آوردہ اند

دنیا میں آپ کو جس قدر تہذیب و تمدن کی رنگینیاں اور علم و ہنر کی ندرت آفرینیاں دکھائی دیتی ہیں انہی عربوں کی رہینِ منت ہیں۔

انہوں نے اتنا عظیم انقلاب کس طرح برپا کر دیا؟ صرف اس طرح کہ

لوحِ دل از نقشِ غیر اللہ شست

از کفِ خاکش دو صد ہنگامہ رست

انہوں نے اللہ کے سوا ہر ایک تصور کو اپنے دل سے محو کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انہوں نے بساطِ زندگی کے ہر گوشے میں انقلاب پیدا کر دیا۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ بتاتے ہیں کہ ایک عظیم انقلاب خود ہمارے زمانے میں بھی برپا ہوا ہے۔ لیکن اس انقلاب، اور مسلمانوں کے لائے ہوئے انقلاب میں ایک بنیادی فرق ہے۔ مسلمانوں نے باطل کے نظام ہائے کہنہ کو مٹایا تو ان کی جگہ حق کا نظام قائم کیا۔ یعنی ان کا انقلاب لا الٰہ — اور الا اللہ، دونوں کا مجموعہ تھا۔ لیکن عہدِ حاضر کا یہ انقلاب صرف لا الٰہ تک رہا۔ الا اللہ اس کے حصے میں نہ آیا۔ اس کا دائرۂ عمل تخریب تک محدود رہا۔ تعمیر نہ کر سکا۔ اس لئے کہ

صحیح تعمیر کی بنیاد دین وحیِ خداوندی پر اٹھتی ہیں اور وحیِ خداوندی سے یہ محروم تھے۔ یہ انقلاب روس کی اشتراکیت ہے۔

ہم چناں بینی کہ در دورِ فرنگ بندگی با خواجگی آمد بجنگ

جس طرح ایران اور روم کی تہذیبوں کے خلاف مسلمانوں نے علمِ انقلاب بلند کیا تھا اسی طرح تہذیبِ فرنگ کے خلاف بھی انقلاب کی آواز اٹھی۔ تہذیبِ فرنگ کی بنیاد بھی ملوکیت اور سرمایہ پرستی پر استوار تھی جسے مذہبی پیشوائیت کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس تہذیب نے دنیا میں عالمگیر غلامی کا جال بچھا رکھا تھا۔ روس کا انقلاب، ملوکیت، سرمایہ پرستی اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں

انسانوں کی اس غلامی کے احساس سے روس کا جگر خون ہوگیا اور اس کے ضمیر نے چلّا چلّا کر کہا کہ استبداد کے اس پورے نظام کو تہس نہس کر دینا چاہیئے۔

آں نظامِ کہنہ را برہم زد است تیز نیشے بر رگِ عالم زد است

اس نے تہیہ کرلیا کہ دنیا سے ہر نظامِ کہنہ کو مٹا دیا جائے اور جسدِ انسانیت کی فصد اس طرح کھولی جائے کہ اس سے تمام فساد آلود خون باہر نکل جائے۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ لکھتے ہیں کہ

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ لا سلاطین۔ لا کلیسا۔ لا الٰہ

میں نے اشتراکیت کے فلسفہ اور نظام کا بغور مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کے پیشِ نظر صرف تخریب ہے تعمیر نہیں۔ بادشاہی کو مٹا دینا چاہیئے۔ مذہبی پیشوائیت کو فنا کر دینا چاہیئے۔ ہر الٰہ کو ختم کر دینا چاہیئے۔

فکرِ او در تندبادِ لا بماند مرکبِ خود را سوئے اِلّا نراند

اس فلسفہ کی آماجگاہ لا کا جھگڑا ہے۔ اور بس۔ اِلّا کی طرف اس کا رُخ ہی نہیں۔ سوال یہ ہے کہ ان تمام باطل نظام ہائے کہنہ کو مٹا دینے کے بعد پھر کیا؟ کیا انسانیت خلا میں زندہ رہ سکتی ہے؟ کیا خالی تخریب سے کوئی مثبت مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس انقلاب کے داعیوں کے دل میں سرمایہ داری، ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات اس قدر تلاطم انگیز تھے کہ اس ہیجان میں انہیں اتنا سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملی کہ اس تخریب کے بعد اگلا تعمیری قدم کیا ہونا چاہیئے۔ اس لئے علامہ اقبالؒ کا خیال تھا کہ

آیدش روزے کہ از زورِ جنوں خویش را زیں تندباد آرد بروں

ایک دن آنے والا ہے کہ یہ لوگ تخریب کے اس جھگڑے سے باہر نکل کر تعمیر کی طرف رُخ کریں گے۔ جب ان کے دل سے انتقام کی

آگئی ہو گی ۔ جب یہ جنون ذرا کم ہو گا تو یہ اس بات کے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ زندگی کا مقصد تخریب نہیں تعمیر ہے ۔
اس وقت یہ محکم اصول ان کے سامنے آئیگا کہ

در مقامِ لا نیاساید حیات
سوئے اِلّا می خرامد کائنات

تخریب کی وادی میں زندگی کو سکون میسر نہیں آسکتا۔ خود نظامِ کائنات اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ ہر تخریب ایک تعمیر کا پیش خیمہ ہوتی ہے ۔ اور یوں یہ کائنات نفی اور اثبات کی اس مسلسل کشمکش سے تعمیر کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے ۔ کائنات کا نصب العین تعمیری ہے ۔

لا و اِلّا سازو برگِ اُمتاں
نفی بے اثبات مرگِ اُمتاں

قوموں کی زندگی اور عروج لا اور اِلّا دونوں کے امتزاج سے ہوتا ہے ۔ جو قوم صرف تخریب کو اپنا نصب العین قرار دے لیتی ہے، فنا ہو جاتی ہے ۔

در محبت پختہ کے گردد خلیل
تا نگردد لا سوئے اِلّا دلیل

حضرت ابراہیمؑ کا واقعہ اس حقیقت کی دلیل ہے کہ محکم فلسفہ حیات وہ ہے جس میں ہر باطل معبود کی نفی کے بعد ایک معبود حقیقی پر ایمان لایا جائے ۔ ان کی قوم اجرام سماوی کی پرستش کرتی تھی، جب انہوں نے آپ سے کہا کہ وہ بھی ستارہ ۔ چاند ۔ سورج کو اپنا معبود تسلیم کریں تو آپ نے کہا کہ دیکھو! ان میں سے ہر ایک تغیر پذیر ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو تغیر پذیر ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا ۔ یہ حصہ لا تھا ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں اپنا رُخ اس معبودِ حقیقی کی طرف کرتا ہوں جو تغیرات سے ماوراء ہے اور تمام کائنات میں اقتدار و اختیار اسی کا کارفرما ہے ۔ یہ حصہ اِلّا تھا ۔ ایمان کی پختگی لا اور اِلّا کے اس امتزاج سے ہوتی ہے ۔

اس کے بعد حضرت علامہؒ اپنے دور کے مدعیانِ علمِ شریعت کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ

ایکہ اندر حجرہ ہا سازی سخن
نعرۂ لا پیشِ نمرودے بزن

تم لوگ حجروں میں بیٹھے، بے معنی بحثوں میں الجھے رہتے ہو ۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ باطل کی قوتوں سے للکار کر کہو کہ تمہیں دنیا میں کوئی اقتدار اور اختیار حاصل نہیں ۔ اپنی فرماں روائی کی مسندوں سے نیچے اترو ۔ دنیا میں کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان پر حکومت کرے ۔ حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے ۔ اور بس ۔

ایں کہ می بینی نیرزد با دوجو
از جلالِ لا الٰہ آگاہ شو

یہ تمہارے مسائل اور مباحث جنہیں تم اس قدر اہمیت دے رہے ہو ان کی کچھ قیمت نہیں ۔ دین کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ پر ہے ۔ یہی وہ قوت ہے جس سے حقیقی اسلام کا بول بالا ہوتا ہے ۔

ہر کہ اندر دست او شمشیر لا ست
جملہ موجودات را فرماں رواست

جو اس حقیقت کو پا جائے اور دنیا سے ہر معبودِ باطل کو مٹانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ خارجی کائنات کی ساری قوتیں اس کے زیر نگیں آجاتی ہیں۔ یہی مقام مومن ہے۔

فقر

علامہ اقبالؒ نے اپنے مفہوم کی وضاحت کے لئے جو جدید اصطلاحات وضع اور اختیار کی تھیں ان میں فقر کی اصطلاح کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ فقر سے ان کی مراد، گداگری۔ محتاجی۔ خانقاہیت یا رہبانیت نہیں۔ اس سے ان کی مراد اس قسم کا استغنا ہے جو انسان میں خدا کی صفت صمدیت کو (علیٰ حد بشریت) منعکس کرتا ہے۔ استغناء کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی طبیعت اس قدر بھری ہوئی ہو کہ دنیا کی بڑی سے بڑی جاذبیت بھی اس کے پاؤں میں لغزش نہ پیدا کر سکے۔ جب وہ جادۂ حق وصداقت پر گامزن اپنے نصب العین کی طرف بڑھے جا رہا ہو تو مادی کائنات کی کوئی کشش اس کے دامن گیر ہو کر، اس کا راستہ نہ روک سکے۔ یاد رہے کہ مردِ مومن، دنیا کی زیبائش و آرائش سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ ان سب سے لذت یاب ہوتا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز اس کے راستے میں حائل ہو کر اس کے لئے زنجیر پا نہیں بن سکتی۔ مومن کی اس کیفیت کو اقبالؒ فقر سے تعبیر کرتا ہے۔ یہی وہ انقلاب ہے جو قوانین خداوندی کے اتباع سے مردِ مومن کے قلب و نگاہ میں پیدا ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں اس قسم کا انقلاب پیدا ہو جائے تو اس کے زورِ بازو کا کون اندازہ کر سکتا ہے؟ یہی وہ فقر ہے جس کے متعلق حضرت علامہؒ کہتے ہیں کہ

چیست فقر اے بندگانِ آب و گِل — یک نگاہِ راہ بیں۔ یک زندہ دل

اے وہ لوگو جو مادی لذائذ کے غلام بن چکے ہو، آؤ تمہیں بتائیں کہ فقر کسے کہتے ہیں! فقر یہ ہے کہ انسان کے سینے میں ایک متحرک قلب ہو جس میں نت نئی آرزوئیں بیدار اور نت نئے مقاصد پیدا ہوتے رہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسی نگاہ جو صحیح راستے کو دیکھتی ہوئی اسے آگے بڑھاتی چلی جائے اور راستہ کی کوئی کشش اس کے لئے تسمہ پا نہ بن جائے۔ یہ ہے فقر یعنی مادی کائنات کا غلام بننے کے بجائے اُسے اپنا غلام بنا لینا۔

فقر کارِ خویش را سنجیدن است — بر دو حرفِ لا الٰہ پیچیدن است

فقر یہ ہے کہ انسان دنیا کی ہر باطل قوت کو ٹھکراتا ہوا آگے بڑھتا جائے اور اپنے اُلجھے ہوئے معاملات کو خود سلجھائے یہ کسی کا دستِ نگر اور محتاج نہ ہو۔

فقرِ خیبر گیر با نانِ شعیر　　بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

اس استغنا سے انسان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ جَو کی روٹی کھا کر اپنے اندر ایسی قوت پیدا کر لیتا ہے جس سے بڑے بڑے محکم قلعوں کے دروازے توڑ ڈالتا ہے اور دنیا کے سلاطین اور اربابِ قوت و اقتدار اس کا شکار ہوتے ہیں۔

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست　　ما امینیم، ایں متاعِ مصطفیٰؐ است

یہ چیز اس طرح سے حاصل ہوتی ہے کہ انسان، قوانینِ خداوندی کے سامنے جھک جائے اور پورے ذوق و شوق سے ان کی اطاعت کرے۔ اس شانِ فقر کی سب سے بڑی مظہر، نبی اکرمؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم ہے۔ یہ فقر حضورؐ کی متاع ہے۔ اور ہم امتی اس کے امین ہیں۔

فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند　　بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند

یہی وہ فقر ہے جس کے سامنے ملائکہ بھی جھکتے ہیں، اس سے کائنات کی قوتیں، انسان کے تابع تسخیر ہو جاتی ہیں۔ فقر کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف میں لائے۔

بر مقامِ دیگر اندازد ترا　　از زجاج الماس می سازد ترا

یہی وہ انقلاب ہے جس سے انسان کچھ سے کچھ بن جاتا ہے۔ اس سے اس میں ایسی پختگی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ کانچ سے الماس بن جاتا ہے۔ کانچ کو ذرا سی ٹھوکر لگ جائے تو وہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ اور الماس ہو لے سے موٹے شیشے کو بھی کاٹ کر کے دیتا ہے۔

برگ و سازِ او ز قرآنِ عظیم　　مردِ درویشے نگنجد در گلیم

یہ فقر قرآن کریم کی متابعت سے حاصل ہوتا ہے یہ خانقاہیت کا گلیم پوش فقر نہیں۔ یہ کائنات پر حکمرانی کرنے والا فقر ہے۔

گرچہ اندر بزم کم گوید سخن　　یک دمِ او گرمیٔ صد انجمن

وہ زیادہ باتیں نہیں کرتا۔ وہ کام کرتا ہے۔ اس میں ایمان اور عمل کی اس قدر حرارت ہوتی ہے کہ اس کا ایک سانس سینکڑوں محفلوں کی گرمی کا باعث بن جاتا ہے۔

بے پراں را ذوقِ پروازے دہد　　پشہ را تمکینِ شہبازے دہد

وہ کمزور و ناتواں انسانوں میں اتنی قوت پیدا کر دیتا ہے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں بلند سے بلند تر مقامات میں پرواز کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ضعیف سے ضعیف تر انسان میں بھی عقابی روح بیدار اور اسے بازوئے شاہیں عطا کر دیتا ہے۔

با سلاطین در فتد مردِ فقیر　　از شکوہِ بوریا لرزد سریر

یہ مردِ فقیر، بادشاہوں سے الجھ جاتا ہے اور اس کے بوریا کی ہیبت سے شاہنشاہوں کے تخت لرز اٹھتے ہیں۔

از جنوں می افگند ہوئے بہ شہر　　وا رہاند خلق را از جبر و قہر

وہ مستانہ وار اپنی دعوتِ انقلاب کو عام کرتا ہے اور اس طرح نوعِ انسان کو ہر قسم کے استبداد اور ہر نوع کی غلامی سے آزاد کراتا ہے۔

می نگیرد جز بآں صحرا مقام ‏ ‏ ‏ ‏ کاندرو شاہیں گریزد از حمام

وہ ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں کسی کو کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوتا۔ اس میں طاقتور انسان، کمزوروں سے دبتا ہے۔

قلبِ او را قوت از جذب و سلوک ‏ ‏ ‏ ‏ پیشِ سلطاں نعرۂ او لاملوک

ایمان کی پختگی اور عمل کی صالحیت اُسے بے پناہ قوت عطا کر دیتی ہے۔ وہ دنیا کے مستبد شاہنشاہوں کے سامنے کھڑا ہو کر برملا کہتا ہے کہ ملوکیت انسانیت کے خلاف جرمِ عظیم ہے۔ اس لئے اسے مٹا دیا جائے گا۔

آتشِ ما سوزناکِ از خاکِ او ‏ ‏ ‏ ‏ شعلہ ترسد از خس و خاشاکِ او

یہی وہ افراد ہیں جن کی سیرت آنے والوں کیلئے وجہ حرارتِ ایمان بنتی ہے اور باطل کی قوتیں ان کے ذکر سے لرزہ براندام ہو جاتی ہیں۔

بر نیفتد ملتے اندر نبرد ‏ ‏ ‏ ‏ تا درو باقیست یک درویش مرد

جب تک کسی قوم میں اس قسم کا ایک فرد بھی باقی ہو وہ مصافِ زندگی میں کسی سے شکست نہیں کھاتی۔

آبروئے ما ز استغنائے اوست ‏ ‏ ‏ ‏ سوزِ ما از شوقِ بے پروائے اوست

ایسے مردِ مومن کا استغنا، ہماری عزت و تکریم کا ضامن ہے اسکی وجہ سے دنیا میں ہماری آبرو باقی ہے۔ اس کا جذبہ ایمان ہمارے دل میں حرارت پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

خویشتن را اندریں آئینہ بیں ‏ ‏ ‏ ‏ تا ترا بخشند سلطانِ مبیں

تم اپنے اندر اس قسم کی سیرت و کردار پیدا کرو ایسے مردِ مومن کو اپنے سامنے ماڈل رکھو پھر دیکھو کہ تمہیں بھی وہ قوت کس طرح حاصل ہو جاتی ہے جو دنیا میں تمہارا سکہ جما دے۔

حکمتِ دیں دل نوازی ہائے فقر

قوتِ دیں بے نیازی ہائے فقر

یہی وہ فقر ہے کہ جب وہ تالیفِ قلوب کی طرف آتا ہے تو اسے دین کی حکمت کہا جاتا ہے اور جب وہ سرکش اور متکبر قوتوں کی چوکھٹوں سے مستانہ وار بے نیازانہ گزرتا ہے تو اسے دین کی قوت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں ‏ ‏ ‏ ‏ مسجدِ من ایں ہمہ روئے زمیں

حضورِ نبی اکرمؐ نے اپنی امت سے فرمایا تھا کہ "تمام روئے زمین میری مسجد ہے" اس کا مطلب یہ تھا کہ دینِ خداوندی کا غلبہ ساری روئے زمین پر ہونا چاہیئے۔

الاماں از گردشِ نُہ آسماں ‏ ‏ ‏ ‏ مسجدِ مومن بدستِ دیگراں

لیکن کس قدر تاسف کا مقام ہے۔ اور یہ انقلاب کیسا جگر پاش ہے کہ آج "مومنوں کی مسجد" (یعنی کرۂ ارض کے مختلف ممالک) دیلم غیروں کے قبضہ میں ہے۔

حق کو سشد بندۂ پاکیزہ کیش　　　تا بگیرد مسجد مولائے خویش

مومن کا فریضہ یہ ہے کہ وہ جان لڑا دے اور اپنے آقا (ص) کی اس مسجد کو غیروں کے قبضہ سے چھڑا لے یہی وہ حقیقت ہے جسے حضرت علامہؒ نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث　　　مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اس کے بعد وہ فقر کے غیر اسلامی تصور کے حاملین (مسلک خانقاہیت کے پیرؤں) سے کہتے ہیں کہ

اے کہ از ترکِ جہاں گوئی مگو　　　ترکِ این دیر کہن تسخیرِ او

تم مسلمانوں کو ترکِ دنیا کی تعلیم دیتے ہو اور اسے دین کا ماحصل قرار دیتے ہو۔ اس تعلیم کو چھوڑو اور مسلمانوں کو یہ غیر اسلامی سبق نہ پڑھاؤ۔ مومن کا "ترک" یہ ہے کہ وہ کائنات کی تمام قوتوں کو مسخر کرے اور انہیں نوع انسان کی بہبود کے لئے قوانین خداوندی کے مطابق عام کردے۔ اس لئے کہ

کمالِ ترک نہیں آب و گِل سے مہجوری　　　کمالِ ترک ہے تسخیرِ خاکی و نوری

صحیح تعلیم یہ ہے کہ

راکبش بودن از و وارستن است　　　از مقامِ آب و گِل برجستن است

اگر تم مادی دنیا سے مغلوب ہو تو یہ روش غیر اسلامی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہو۔ لیکن اگر تم اس پر غالب ہو اور اسے مسخر کر رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس میں پھنسے ہوئے نہیں۔ "مادی آلائشوں کا ترک" انہیں اپنے تابع تسخیر بنا لینا ہے۔

صیدِ مومن این جہانِ آب و گِل　　　باز را گوئی کہ صیدِ خود بہل

مادی دنیا تو مومن کا شکار ہے۔ اسے ترکِ دنیا کی تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ باز سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنے شکار کو چھوڑ دے۔ کس قدر غلط ہے یہ تعلیم۔

حل نہ شد این معنیٔ مشکل مرا　　　شاہیں از افلاک بگریزد۔ چرا؟

میں تو اس معمہ کو سمجھ نہیں سکا کہ عقاب کو یہ سبق دیا جائے کہ وہ فضا کی پہنائیوں میں اڑنا چھوڑ دے! وہ کیوں ایسا کرے؟

وائے آں شاہیں کہ شاہینی نکرد　　　پر نگے از چنگِ او نامد برد

در کنامے ماند و اندر سرنگوں　　　پر نزد اندر فضائے نیلگوں

کس قدر بدقسمت ہے وہ عقاب، جس میں خوئے عقابی باقی نہ رہے۔ وہ اپنے شکار پر جھپٹنے کے بجائے اپنے گھونسلے میں سر چھپائے پڑا رہے۔ تصوف، مسلمان کو یہی سکھاتا ہے اور اسی لئے حضرت علامہؒ نے اسے، اسلام کی سرزمین میں اجنبی پودے سے تعبیر کیا ہے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے "قرآنی فقر" اور فقرِ کافرانہ کے مزید خطوط امتیاز واضح کئے ہیں۔ ان تصریحات کو آئندہ قسط میں سامنے لایا جائے گا۔

جس طرح تاج محل آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے جس طرح آج سے تین سو سال پہلے۔ اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے محترم پرویز صاحب کی زندۂ جاوید تصنیف

سلیم کے نام خطوط

اور

انسان نے کیا سوچا؟

ہیں۔ جوں جوں دن گزرتے جاتے ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کتابوں نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ انسان نے کیا سوچا؟ ——— قیمت ۱۲ روپے

سلیم کے نام خطوط (تین خوبصورت جلدوں میں) جلد اول ۸ روپے ——— جلد دوم ۶ روپے ——— جلد سوم ۶ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

جس جہانِ نو کا تصور ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے پیش کیا اس کے خدوخال کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ آپ اس مجموعہ کو دیکھیں جسے

اقبالؒ اور قرآن

بیک وقت آپ کے سامنے آجائے۔ قرآن کے حقائق اور اقبالؒ کا بیان جن دقائق کا اس سے زیادہ دلکش مرقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ اس سے قبل اقبالؒ پر بہت کچھ لکھا جا چکا لیکن پرویز صاحب کی گرانمایہ تصنیف

اقبال اور قرآن

سے جو کچھ آپ کے سامنے آئے گا اس سے پہلے آپ نے کہیں نہیں دیکھا ہوگا

قیمت ۲ روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

صفدر سلیمی ★

نشاۃِ ثانیہ کا نقیب

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما!
(اقبالؒ)

اس سوال کے جواب میں کہ "دنیا میں سب سے زیادہ مظلوم کون ہے؟" اقبالؒ نے کہا تھا کہ
کارگہِ حیات میں آج قرآن سے بڑھ کر "مظلوم" کوئی نہیں۔

قرآن اس لئے آیا تھا کہ مجبور و مقہور نوعِ انسانی کو حریتِ فکر و نظر کی انقلاب آفریں جولانیوں سے بہرہ ور کرے اور ان زنجیروں کو توڑ دے جو ازمنۂ گزشتہ سے بے بسی اور بیچارگی کے بندھنوں میں جکڑے چلی آرہی تھیں۔ کارگہِ حیات میں اس کے نزول کا مقصود و مطلوب یہ تھا کہ حریت و آزادی کے ان بے مثال تصورات سے جو اس نے انسانی قلب و نگاہ کو عطا کئے تھے سطحِ ارض پر جنت کی وہ بساط بچھ جائے جس کی فضائے بسیط میں انسان سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو سکے اور اس کی مضمر صلاحیتیں حسن و خوبی سے نشو و نما پاسکیں۔ لیکن حیرت کی انتہا تھی کہ خیر القرون کی ایک مختصری مدت کے بعد قرآن حیاتِ انسانی کا مرکز و محور نہ رہا اور عقل و خود بین کی مفاد پرستیوں نے جنتِ ارضی کی اس بساط کو الٹ کر رکھ دیا جو حضور رسالتمآبؐ اَلَّذِیْنَ مَعَہٗ کے مقدس ہاتھوں بچھائی گئی تھی۔ یہ کچھ قرآن کے ساتھ بیتی۔ پھر وہ یا تو ریشمیں غلافوں میں لپیٹ کر بر طاق رکھ دیا گیا۔ یا پھر اس کے اوراق آنے لگے تو تعویذوں، گنڈوں ورد و وظائف، حصولِ ثواب اور مردوں کو بخشوانے کے لئے۔ وہ زندگی کی حقیقی امنگیں اور عملی تقاضے، صدیوں سے برابر اس کی برکتوں اور سعادتوں سے بے نصیب چلے آئے۔

ایسا کیوں ہوا؟ یہ ایک الگ داستان ہے اور انتہائی دلدوز و جگر سوز (اس داستانِ غم کی تفصیل بارہا طلوعِ اسلام کے صفحات میں آچکی ہے) اقبالؒ نے اسی بنا پر قرآن کو سب سے بڑھ کر مظلوم قرار دیا تھا لیکن جب اس نے خود قرآن کی آواز بلند

کی اور اس کے فکر و بصیرت کی دعوت دل کی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کر ابھری تو اس کی دعوتِ انقلاب کو بھی قرآن کی سی مظلومی سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ بےنصیبی کی انتہا نہیں تو اور کیا ہے کہ عصرِ حاضر کا یہ بےمثال داعیٔ انقلاب آج شاعروں اور فلسفیوں کی قطاروں میں کھڑا کر دیا گیا۔ ہماری نشاۃ ثانیہ کے جس عظیم القدر نقیب نے فکری جمود کے قبرستانوں میں انقلابِ حیات کے شعلے بھڑکائے تھے۔ جس کی نیزِ انقلاب صورِ اسرافیل بن کر فضاؤں میں گونجی تھی جس کی نشید قرآنی میں دمِ مسیحائی کی حیات بخشیاں انگڑائی لے رہی تھیں، جس کا نغمۂ نوبہار خیابانِ ملت میں نئی بہاروں کی نوید تھا۔ ہاں! جس نے پکار پکار کر کہا تھا کہ

میں نہ شاعر ہوں، نہ مُلّا، نہ فقیہ

اور یہ بھی کہ

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشۂ نظر کا فساد

حکیمِ انقلاب اور ناداں دوست

اس اقبالؒ کو کبھی شاعروں اور فلسفیوں سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ کبھی ملّا و فقیہ کی مصلحت کوشیاں اپنے صنم خانوں کی موت آور نقش گری میں اس کے اشعار سے آب و تاب حاصل کرتی ہیں۔ یہ عظیم و جلیل داعیٔ انقلاب کہیں ایک شاعر کی حیثیت سے سخن طرازوں کا ممدوح ہے۔ اور کہیں ایک فلسفی کی حیثیت سے تنقیدی موشگافیوں کے لئے زیبِ داستاں۔ کہیں طاؤس و رباب کی زمزمہ آرائیاں اسکے نغموں سے لذت گیر ہیں اور کہیں خودساختہ مجاوروں کی اجارہ داری اس کے مقام و پیام کو اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کے اس نالہ و فریاد کے باوجود ہو رہا ہے کہ

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک — ہمہ گفتند با ما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر — چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

اپنے ان "آشناؤں اور دوستوں" کے متعلق وہ کس سوز و ساز اور رنج و ملال سے کہتا ہے کہ

آشنائے من ز من بیگانہ رفت — از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم — تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من — رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بےتابیٔ جانم ندید — آشکارم دید و پنہانم ندید

اقبالؒ کی سنّے نوازیوں کے پیرایہ میں اور اس کی آتش نوائیوں کے پیرِ جان میں کی دعوتِ انقلاب کے سرچشمہ سے اس قدر بےنیاز اور دورگرداں رہے جس قدر کہ اس کے بیگانے۔ اس نے بتایا تھا کہ

گوہر دریائے قرآں سفتہ ام   شرح رمز صبغۃ اللہ گفتہ ام
از تب و تابم نصیب خود بگیر   بعد ازیں ناید چو من مرد فقیر

یہ تھا اقبالؒ۔ ہماری عظمت رفتہ کا وہ داعی جو دم مرگ اپنوں کی ناحقیقت شناسیوں کا شکوہ سنج رہا۔ اس کی زندگی کا سب سے بڑا غم یہی تھا کہ اس کے اپنے شیدائی تک اس کے پیغام حیات کی گہرائیوں سے ناآشنائے محض رہے۔ اس کی جگر سوز اور خونچکاں اشکباریوں میں یہ فریاد گونجتی رہی کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات
کہنہ ہے بزم کائنات تازہ ہیں میرے واردات

اس کی زخم خوردہ حسرتیں اور ارمان برابر پکارتے رہے کہ

کیا اور غزنوی نہیں کارگہ حیات میں ؟
بیٹھے ہیں کب سے منتظر عرب و عجم کے سومنات

شبستان ملت کی یہ شمع رخشندہ شب و روز ان پروانوں کے لئے اشکبار اور وقف انتظار رہی۔ جن کے رقص بسمل سے قومی جمود کی راکھ میں بھڑکتے ہوئے شعلوں کا سوز و ساز اور تب و تاب حیات نو کی آئینہ دار بن سکے۔ لیکن اسے کہنا ہی پڑا کہ

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اور پھر اس کی نگہ انتظار تھک تھک کے گر پڑی۔ اپنی ملت کے کاروان حیات میں اسے چاروں طرف فکر و نظر کی درماندگی اور قلوب و اذہان کی زوال و انحطاط کے سوا اور کچھ نظر نہ آیا۔ مایوسی اقبالؒ کے نزدیک کفر کا دوسرا نام تھا۔ لیکن تاریخ کی اس تلخ حقیقت سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ تو ایک آہ آتشیں کی صورت میں اس کے لبوں پر تھرتھرانے لگی اور وہ پکار اٹھا۔

ذکر عرب کے سوز میں، فکر عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات!

دعوت انقلاب کا یہ وہ نازک مرحلہ تھا جہاں اقبالؒ قوم کے بڑے بوڑھوں سے مایوس ہو گیا۔ پیران کہن سال کے رگ و پے میں زندگی کا خون منجمد ہو چکا تھا۔ انقلاب حیات کی بجلیاں اپنی تڑپ کھو چکی تھیں اور دوسری طرف ضمیر کائنات کی گہرائیوں میں ایک نیا انقلاب انگڑائیاں لے رہا تھا۔ مشرق و مغرب کے صنم خانوں میں زندگی کے تقاضے ایک نئے عنوان سے ابھر ابھر کر سامنے آرہے تھے۔ نئے سازوں کی زمزمہ آرائیوں میں ایک نیا راگ گایا جا رہا تھا۔ ہمالے کے ابلتے ہوئے چشمے گران خواب چینیوں کے ضمیر میں ابھرتی ہوئی زندگی کے آئینہ دار بن رہے تھے۔ چاروں طرف

انقلاب آفریں اُمنگوں اور عزائم کی باز آفرینیوں کے ہنگامے بپا تھے۔ حکیمِ انقلاب کی نگاہیں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں

اقبالؒ قرآن کے بابِ عالی پر

دیکھنے کے لئے بار بار اٹھتی تھیں۔ لیکن اس کا اپنا کارواں متاعِ حیات کو لٹا کر گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے جو موت سے کم نہ تھی اقبالؒ نے پکارا۔

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اقبالؒ جانتا تھا کہ اس قافلہ کا وجود ہنگامۂ عالم کی روح ہے۔ اور اس کی موت سے نوعِ انسانی ہر متاعِ عزیز کو کھو بیٹھے گی کتنے ہی اندیشہ ہائے دور و دراز اس کے دل میں اُبھرے۔ کیا یہ قافلہ اسی طرح سرِ راہ دم توڑ دے گا؟ کیا اس کے حیات آفریں نغمے اور نفیرِ انقلاب فضاؤں میں کھو کر رہ جائے گی؟ کیا اس کی نشاۃِ ثانیہ کا کوئی امکان باقی نہیں؟ کتنے ہی اضطراب انگیز اور ہیجان خیز سوالات اسے طلسمِ پیچ و تاب بنانے چلے گئے۔ اپنے نالہ ہائے نیم شب کا نیاز اور خلوت و انجمن کا گداز لیے۔ اس لئے وہ بالآخر قرآن کے بابِ عالی پر حاضر ہو گیا۔ اس بارگاہِ اقدس سے کبھی انسانی زندگی کو وہ گوہرِ مقصود حاصل ہوا تھا جس کے بعد اس کے حسنِ طلب کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ یہیں سے اقبالؒ کو وہ سب کچھ مل گیا جو اس کی دعائے نیم شبی کا صلہ، بلکہ اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھا۔ اور جب وہ اس بارگاہِ عالیہ سے مالامال ہو کر لوٹا تو فرطِ مسرت میں والہانہ طور پر یہ گیت اس کے لبوں پر رقص کر رہے تھے۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن
خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ او رحمۃٌ للعالمیں
از جہانبانی نوازد سازِ او مسندِ جم گشت پا اندازِ او

ملت کی اساس

قرآن کے بابِ عالی سے اقبالؒ کو جو متاعِ گراں بہا نصیب ہوئی وہ ملت کی نشاۃِ ثانیہ کی کفیل تھی۔ اس میں ملت کے از سرِ نو ابھرنے اور پھولنے پھلنے کا پورا سامان موجود تھا۔ چنانچہ جب وہ اس بابِ عالی سے ملت کی بارگاہ میں واپس لوٹا تو قرآنی حقائق کی روشنی میں حضرت اقبال کی منزلوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس نے سب سے پہلے افرادِ ملت پر مرکز کی اہمیت واضح کی۔ اس کی نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ افرادِ ملت وطن، رنگ، نسل اور عقائد کے اختلاف کی بنا پر مختلف گروہوں میں بٹ چکے ہیں اور ان کی جمعیت ٹکڑے ٹکڑے ہو چکی ہے۔ کہیں وطن کی

اساس پر انہیں نیشنلزم کے نئے سانچوں میں ڈھالا جا رہا ہے۔ کہیں ذات پات اور قبیلہ سازی کے تعصبات گروہ بندیاں پیدا کر رہے ہیں اور کہیں سیاسی اور معاشی تصورات کی بنا پر انہیں دعوتِ تنظیم دی جا رہی ہے۔ قرآن اس قسم کی تمام تفرقہ بازیوں کو وحدتِ دین کے منافی اور کھلا شرک قرار دے رہا تھا۔ اقبالؔ نے بھی ملت کو اس کی اس تباہ کن روش کے اثرات سے خبردار کرنا فرض سمجھا۔ اور ہلاکت کی ان راہوں سے متنبہ کرتے ہوئے اس نے وحدتِ ملت کی اہمیت یوں واضح کی۔

چیست ملت اے کہ گوئی لا الٰہ　　با ہزاراں چشم بودن یک نگاہ
قوم را ربط و نظام از مرکزے　　روزگارش را دوام از مرکزے

پھر وہ تمام اضافی نسبتوں کا رشتہ کاٹ کر افرادِ ملت کو اس مرکز و اساس کے اپنانے کی دعوت دیتا ہے جسے قلب و نگاہ کی ہم آہنگی اور دین و ایمان کی وحدت و اشتراک کہا جاتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں سنئے!

ملتِ ما را اساسِ دیگر است　　این اساس اندر دلِ ما مضمر است
نیست از روم و عرب پیوندِ ما　　نیست پابندِ نسب پیوندِ ما
دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم　　زین جہت با یک دگر پیوستہ ایم
رشتۂ این قوم مثلِ انجم است　　چون نگہ ہم از نگاہِ ما گم است
تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما　　یک نما یک بین یک اندیشیم ما
مدعائے ما مآلِ ما یکیست　　طرز و اندازِ خیالِ ما یکیست

ما ز نعمت ہائے اُو اخوان شدیم
یک زبان و یک دل و یک جان شدیم

پھر اس کی شدتِ آرزو اور بیتابیٔ تمنا اسے خدا کی بارگاہ میں لے جاتی ہے اور پھر یہ بے تاب آرزوئیں اور تڑپتی ہوئی امنگیں دعا بن کر لبوں پر آ جاتی ہیں۔ وہ پکارتا ہے

ما پریشاں در جہاں چوں اختریم　　ہمدم و بیگانہ از یک دیگریم
باز ایں اوراق را شیرازہ کن　　باز آئینِ محبت تازہ کن
ہمچو شبنم دیدہ گریاں شدم　　تا امینِ آتشِ پنہاں شدم
من مثالِ لالۂ صحراستم　　درمیانِ محفلے تنہاستم

ملت کے مستقبل پر اعتماد اقبالؔ جب اختلاف و انتشار کی مایوس کن فضاؤں میں وحدت و اخوت کے یہ انقلاب آفریں نغمے الاپ رہا تھا تو اس کے قلب و نگاہ کی گہرائیاں یاس و قنوط کے تاثرات سے قطعاً پاک تھیں۔

قرآن نے مایوسی کو ایمان کے منافی قرار دیا تھا اور اقبالؒ کے دل میں امید کی وہ شمع روشن کی تھی جو افرادِ ملت کے قلوب کو بھی مایوسی کے اندھیروں سے نجات دلا کر ایک دعوتِ انقلاب کی تابناکیاں عطا کر رہی تھی۔ حیاتِ ملی کی موت آگیں ساعتوں میں بھی یہ دانائے راز اس یقینِ محکم سے مالامال تھا کہ اس کی ملت کا وجود اقوامِ عالم کی زندگی کا مرکز و محور ہے۔ اور اگر یہ ملت مٹ گئی تو اقوامِ عالم کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا اور عالمِ انسانیت کے سارے ہنگامے موت کی آغوش میں سما جائیں گے۔ چنانچہ قومی زوال اور شکست کے اندوہناک مراحل میں بھی وہ ببانگِ دہل پکار رہا تھا کہ

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما
گلستاں میرد اگر میریم ما

یعنی اگر ہم مٹ گئے تو گلشنِ ہستی کی بہاریں بھی ساتھ ہی رخصت ہو جائیں گی۔ احساسِ خودی کے ولولہ انگیز تاثرات میں اس نے زمانے کے چیلنج کا جواب دیتے ہوئے تاریخ کی جس عظیم حقیقت کا اعلان کیا تھا وہ انہی کے الفاظ میں سنئے!

تخمِ دیں در کشتِ دلہا کاشتیم — پردہ از رخسارِ حق برداشتیم
از خمِ حق بادۂ گلگوں زدیم — بر کہن میخانہ ہا شبخوں زدیم
کشتِ حق سیراب گشت از خونِ ما — حق پرستانِ جہاں ممنونِ ما
عالم از ما صاحبِ تکبیر شد — از گلِ ما کعبہ ہا تعمیر شد
در نگاہِ او زیاں کادیم ما — کعبہ پنداریم ما، خواہیم ما
اعتبار از لا الٰہ داریم ما — ہر دو عالم را نگہ داریم ما
از غمِ امروز و فردا رستہ ایم — با کسے عہدِ محبت بستہ ایم
در دلِ حق سرِّ مکنونیم ما — وارثِ موسیٰ و ہارونیم ما
مہر و مہ روشن ز تابِ ما ہنوز — برقہا دارد سحابِ ما ہنوز

مرکزِ امید — نئی نسل

تاریخ کے ان زندہ جاوید حقائق کے ساتھ ساتھ اصل مسئلہ ملتِ اسلامیہ کے از سرِ نو ابھرنے اور عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کا تھا۔ ملت کے بڑے بوڑھوں کا خون سرد پڑ چکا تھا۔ ایسی صورت میں ہو تو کیا ہو؟ اس کا جواب قرآن کی بارگاہ سے ہی مل سکتا تھا۔ اقبال کی نگاہیں بھی لازماً اسی بارگاہ کی طرف اٹھیں۔ قومِ بنی اسرائیل کی داستانِ زوال ابھر کر نگاہوں کے سامنے آگئی اور ساتھ ہی صاحبِ ضربِ کلیمؑ کی وہ آسمانی دعوتِ انقلاب بھی جو اس جلیل القدر پیغمبر کی سالہاسال کی کد و کاوش کے باوجود اس قوم کے بڑے بوڑھوں کی بوسیدہ ہڈیوں میں زندگی کی حرارت پیدا نہ کر سکی۔ اور ان کی بازآفرینی اور عروجِ تازہ

اقبال کے روشن امکانات اُبھر کر سامنے آئے تو صرف نئی نسل کی تربیت اور ان پیکرانِ آب و گل میں عقابی روح بیدار کرنے سے ہی داستان سامنے آئی اور اقبالؒ بے ساختہ پکار اٹھا کہ ؏

اے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

قرآن کی کہانیاں دل بہلانے کا سامان نہیں یہ قوموں کی حیات و ممات اور عروج و زوال کے حقیقت کشا نشانِ راہ ہیں جو بہر بھٹکے ہوئے کاروانِ حیات کو منزل کا سراغ دیتے ہیں۔ اقبالؒ کو بھی گم گشتہ نشان مل گیا اور اس نے اپنی دعوت انقلاب کا رُخ اُبھرتی ہوئی نئی نسل کی طرف پھیر دیا۔ ماحول کی تاریکیوں میں اس کی یہ پرسوز آواز سنائی دی۔

من کہ نومیدم ز پیرانِ کہن — دارم از روزے کہ می آید سخن

بر جوانان سہل کن حرفِ مرا — بہرِ شاں پایاب کن ژرفِ مرا

اس کی نگاہیں ہمارے مکتبوں کی طرف اٹھیں جہاں ہزاروں نہیں لاکھوں نوجوان تعلیم و تربیت کے حصول کے لئے اپنی زندگی کا قیمتی حصہ وقف کئے ہوئے تھے۔ وہ خود بھی اسی فضا میں پروان چڑھا تھا۔ اور تعلیم و تربیت کے نام پر جو کھیل وہاں کھیلا جا رہا تھا اس سے بے خبر نہ تھا۔ مغربی طرزِ تعلیم کے کالج اور یونیورسٹیاں ہوں یا مُلّا کا مکتب اور شیخ الحدیث کا دارالعلوم ہر دو مقامات کی فضا زندگی کے درخشندہ تصورات سے بے نصیب تھی۔ اقبالؒ نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔

اُٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

اور پھر یہ آہ شکایت سی بن کر یوں لبوں پر آئی۔

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے

سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

خالدؓ و فاروقؓ جیسے شیرانِ صف شکن کی جہاد آفریں روایات کے وارث ان درسگاہوں میں عہد رفتہ کی ہر متاعِ عزیز سے محروم ہوتے جا رہے تھے۔ یہ تعلیم ان شاہین بچوں کو ذوقِ پرواز سے بے نصیب کئے جا رہی تھی۔ اقبالؒ کی اشکبار نگاہیں یہ سب کچھ بیٹھے دیکھ رہی تھیں۔ چنانچہ خونِ جگر کو قلم کی نوک پر لاتے ہوئے وہ نوحہ خواں ہوا۔

جوانے خوش گلے، رنگیں کلاہے — نگاہِ او چو سشیراں بے پناہے

بہ مکتب علم میشی را بیاموخت — میسّر نایدش برگِ گیاہے!

ملت کے شاہین بچوں کی حرماں نصیبیوں کا ماتم کرتے ہوئے اس نے کہا

ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ — ظلمت آبادِ ضمیرش بے چراغ

مکتب از وے جذبۂ دیں در ربود — از وجودش ایں قدر دانم کہ بود
شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر — از مقامِ او نداد او را خبر

اور شیخِ مکتب کی اس کم نگہی اور کم سوادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ

نوا از سینۂ مرغِ چمن رفت — ز خونِ لالہ آں سوزِ کہن بُرد
بایں مکتب بایں دانش چہ نازی — کہ ناں در کف نداد و جاں ز تن بُرد

یہ سب کچھ ایک داعیِ انقلاب کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ ہر نئی نسل قوم کے مستقبل کی امین و پاسبان بنتی ہے۔ اور جب تعلیم و تربیت کے نام پر ان پیکرانِ آب و گل سے زندگی کی تب و تاب چھین لی جائے تو ملت کے مستقبل سے اس سے بڑھ کر ظلم اور کیا ہو گا۔ اقبالؒ کو ان درسگاہوں سے نفرت ہو گئی۔ اسی جذبہ کے زیرِ اثر تلملا کر اس نے کہا کہ

بآں مومن خدا کارے ندارد — کہ در تن جانِ بیدارے ندارد
ازاں از مکتبِ یاراں گریزم — جوانِ خود نگہدارے ندارد

اس نے ایک بار پھر اس تلخ حقیقت کی وضاحت کی کہ ہماری درسگاہوں اور ان کے اربابِ بست و کشاد کے سامنے کوئی بلند اور تعمیری مقصد نہیں۔ غیر ملکی حکمرانوں کے پیشِ نظر اپنے دفتری نظام کے لیے محض کلرک تیار کرنا تھا۔ اس کے لیے انہوں نے حسبِ منشا نصابِ تعلیم کو رائج کر لیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری ابھرتی ہوئی ہر نسل زندگی کی ارتقا پذیر صلاحیتوں کو کھو بیٹھی۔ اسی صورتِ حال کی ترجمانی کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا۔

مکتب از مقصودِ خویش آگاہ نیست — تا بجذبِ اندرونش راہ نیست
نورِ فطرت را ز جانہا پاک شست — یک گلِ رعنا ز شاخِ اُو نرست

یہ اسی قسم کی تعلیم کے اثرات تھے کہ ملت کے پیر و جواں ایک ہی رنگ میں رنگے گئے۔ ان کے سینوں میں غیرتِ ملی کی چنگاریاں سرد پڑ گئیں۔ جسمانی آرائش و تزئین اور نمود و نمائش نوجوانوں کی آرزو اور مقصود قرار پا گئی اور ان کا وجود چلتی پھرتی لاشوں کی حیثیت اختیار کر گیا۔

از حیا بیگانہ پیرانِ کہن — نوجواناں چوں زناں مشغولِ تن
در دلِ شاں آرزو ہا بے ثبات — مردہ زایند از بطونِ اُمہات!

اور اس کا نتیجہ یہ کہ ملت میں زندگی کے آثار باقی نہ رہے اور اس کی مایوسیوں میں امید کی کوئی کرن ضیا بار نہ ہوئی اور وہ مسلمان جس کی نگاہوں کی گردش قوموں کی تقدیریں بدل دیتی تھی۔ اس کیفیت سے دوچار ہو گیا کہ

ملتے خاکسترِ اُو بے شرر — صبحِ اُو از شامِ او تاریک تر

یہ سب کچھ ایک حقیقت تھا — ایک تلخ حقیقت — ایک واقعہ تھا بے حد جگر سوز۔ ایک داستان تھی بڑی اندوہناک۔ لیکن اقبالؒ عہدِ رفتہ کا مرثیہ خواں نہیں تھا۔ وہ نشاۃ ثانیہ کا نقیب تھا۔ ایک حکیم انقلاب تھا اور اس کی دعوت ایک بانگِ رحیل تھی جس میں تخلیقِ مقاصد اور ذوقِ سفر کی بجلیاں تلملا رہی تھیں۔ چنانچہ واقعات وحقائق کی یہ الم انگیز تصویر پیش کرنے کے بعد اس نے نوجوانوں کو دعوتِ پیکار دی اور اس کا یہ نعرۂ مستانہ فضاؤں میں گونج اٹھا۔

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما   اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما
غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام   تا بدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما
مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پرویں گذشت   ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما
حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گل   آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

اس نے ملت کے ہر نوجوان کو پکارا کہ

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشتِ پرے داری
بیا من با تو آموزم طریقِ شاہبازی را

شاہبازوں کا مقام عطا کرنے اور ذوقِ پرواز کے ولولوں کو حرکت میں لانے کے لئے اسے جواں مردوں کی تلاش تھی۔ جو ایک بار پھر عظمتِ رفتہ کی یاد تازہ کر سکیں۔ یعنی

جواں مردے کہ خود را فاش بیند   جہانِ کہنہ را باز آفریند
ہزاراں انجمن اندر طوافش   کہ او با خویشتن خلوت گزیند

چنانچہ اس نے ملت کے ان جگر پاروں کو یاد دلایا کہ

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں   نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں
نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے   اُمیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں
نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر   تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

پھر ایک نئے انداز سے اس نے انکی عقابی روح کو جھنجھوڑا اور بتایا

افسوس صد افسوس کہ شاہیں نہ بنا تو   دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات
تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے   ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے کردار کے غازیوں کی تلاش تھی۔ اس نے صوفیوں کے نہاں خانوں کی فضا کو دیکھا تھا۔ شاعروں کے نغمہ ہائے بے ذوق سنے تھے لیکن ان میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہ تھی جو انقلابِ حیات کا سامان بن سکے۔ حسرت و یاس کے

احساس سے یہ آواز اس کے لبوں پر اُبھری۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال — مُلّا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار!
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق — افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار!
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

اس نے بے ذوق تمناؤں اور موہوم اُمیدوں میں کھوئے ہوئے ان عافیت کوشوں کو میدانِ تگ و تاز کی طرف بلایا۔ اور تقدیرِ اُمم کے سربستہ راز سامنے لاتے ہوئے کہا۔

راز ہے راز ہے تقدیرِ جہانِ تگ و تاز — جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
صفِ خبگاہ میں مردانِ خدا کی تکبیر — جوشِ کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز!

اور پھر یہ بھی کہ

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے — شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

ملت کی نشاۃِ ثانیہ کے لئے وہ اس کے شاہین بچوں کو پھر جہانگیری اور سرفرشی کے ولولوں سے سرشار دیکھنا چاہتا تھا اس کی بے تابیٔ تمنا "طارق کی دعا" بن کر فضا میں مرتعش ہوئی۔ کس قدر جہانگیر تھی یہ نغمۂ انقلاب!

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے — جنہیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے — قبا چاہیئے اس کو خونِ عرب سے

دخترانِ ملت کی اہمیت

اقبالؒ کی یہ دعوتِ انقلاب نوجوانانِ ملت کے لئے تھی۔ وہ ان شاہین بچوں کو ایک بار پھر مائل بہ پرواز دیکھنے کا آرزومند تھا۔ ان کے دلوں میں انقلاب آفریں اُمنگیں اور عزائم بیدار کر کے ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بروئے تگ و تاز لانا چاہتا تھا۔ یہی نوجوان کارگہِ حیات میں مردانہ وار قوم کی شامِ غم کو صبحِ اُمید سے بدل سکتے تھے۔ لیکن ایک قوم اور ملت محض اپنے نوجوانوں سے عبارت نہیں اقوام و ملل کے شاندار مستقبل کی شایانِ شان تعمیر کا انحصار صرف ان کے "سلیم بیٹوں" پر نہیں بلکہ ان کی "طاہرہ بیٹیاں" بھی اس تعمیر میں برابر کی شریک ہونی چاہئیں۔ اگر ان کا اجتماعی شعور بیدار نہ ہو اور وہ اپنے فریضۂ ملی سے کما حقہٗ عہدہ برا ہونے کے قابل نہ ہوں تو قومی نشوونما کے سہانے خواب کبھی حاصلِ تعبیر کو نہیں پہنچ سکتے چنانچہ جہاں اقبالؒ نے اپنی ملت کے نوجوانوں کے کردار کی خامیوں کی نشان دہی کی اور انہیں ان کی منزل سے خبردار کیا وہاں ملت کی بہو بیٹیوں کو بھی تقلیدِ مغرب کی نادانستہ روش پر ملامت کی اور انہیں بڑے حسین اور دل نشین پیرائے میں اپنا مقام اور فریضہ یاد دلایا۔

وہ سب سے پہلے تہذیب مغرب کی اندھی تقلید کی اس تصویر کو سامنے لاتا ہے جو ایک غیور قوم کی غیرت و حمیت کے لئے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں کس درد و کرب سے اسے یہ کہنا پڑا کہ

دختران او بزلف خود اسیر — شوخ چشم و خود نما و خردہ گیر

ساختہ، پرداختہ، دل باختہ — ابروان مثل دو تیغ آختہ

ساعد سیمین شان عیش نظر — سینۂ ماہی بہ موج اندر نگر

اور اس روش کا انجام یہ کہ

ملتے خاکستر او بے شرر — صبح او از شام او تاریک تر

اس المیہ پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے اس دانائے راز نے قلب و نگاہ کے پورے خلوص سے قوم کی ماؤں اور بہو بیٹیوں کو مخاطب کیا۔ اور عصمت و ناموس کی حقیقی قدریں ان کے سامنے لاتے ہوئے انہیں ان کا مقام یاد دلایا۔ اس کی دعوتِ انقلاب کا حسنِ انداز ملاحظہ ہو اور فکر و نظر کی وہ وارفتگی بھی جو اس دعوت کو انوکھی دلکشائیاں عطا کر رہی ہے اپنے مخصوص انداز میں وہ پکارتا ہے۔

از امومت پختہ تر تعمیر ما — در خط سیمائے او تقدیر ما!

از امومت گرم رفتار حیات — از امومت کشف اسرار حیات

از امومت پیچ و تاب جوئے ما — موج و گرداب و حباب جوئے ما

وہ تہذیب مغرب کی پرستار بہو بیٹیوں سے پناہ مانگتا ہے اور اس گلِ جنت دیدہ کو گلشنِ ملت کی توہین اور دامنِ ملت پر بدنما داغ قرار دیتے ہوئے صاف کہتا ہے کہ

ایں گل از بستان ما نارستہ بہ

داغش از دامانِ ملت شستہ بہ

قوم کی غیور اور فرض شناس طاہرہ بیٹیوں کو وہ ملت کا سب سے قیمتی سرمایہ قرار دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر — نیست از نقد و قماش و سیم و زر!

مال او فرزند ہائے تندرست — تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

حافظ رمزِ اخوت مادراں

قوتِ قرآن و ملت مادراں!

ان حقائق کی نقاب کشائی کے بعد عظمتِ رفتہ کا یہ داعی ایک بار پھر دخترانِ ملت سے براہ راست خطاب کرتا ہے

ان کا مقام واضح کرتا ہے۔ زمانے کی فتنہ سامانیوں اور غلط اندازیوں کی پُرپیچ راہوں کے خطرات سامنے لاتا ہے اور پھر بتاتا ہے کہ ان کے فرض کی پکار ان سے کس قسم کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اقبالؒ کا یہ پیغام اقبالؒ ہی کے حقیقت کشا انداز میں سنیئے!

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما ۔۔۔ تاب تو سرمایۂ فانوسِ ما
طینتِ پاکِ تو ما را رحمت است ۔۔۔ قوتِ دین و اساسِ ملت است
اے امینِ نعمتِ آئینِ حق! ۔۔۔ در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق
آب بندِ نخلِ جمعیت توئی ۔۔۔ حافظِ سرمایۂ ملت توئی
ہوشیار از دستبردِ روزگار ۔۔۔ گیر فرزندانِ خود را بر کنار

دینِ مُلّا سے خطرہ

اقبال کے یہ درد بھرے پیغامات اور نالہ ہائے نیم شبی ایک نقیبِ انقلاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ نشید قرآنی تھی جو نئی نسل کے قلب و نگاہ کو صبحِ انقلاب کی جلوہ باریوں سے مستنیر کر سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک خطرہ ہر لحظہ اس کی نگاہوں کے سامنے موجود تھا اور وہ تھی دینِ مُلّا کی وہ قدامت پسندی جو ہر دور میں حریتِ فکر و نظر کو ذہنی جمود کی برفانی سلوں میں بدلتی رہی۔ اقبالؒ اس ذہنیت کی تاریکی کارفرمائیوں سے آگاہ تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ یہ ذہنیت کس طرح امت کی بیداری اور کشمکشِ انقلاب کی راہ میں ہمیشہ روک بن کر کھڑی رہی۔ چنانچہ اس خطرہ سے خبردار کرتے ہوئے اس نے نوجوانانِ ملت کو بتایا کہ

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا ۔۔۔ اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

اور

موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں

دینِ مُلّا کی راہ اس دینِ خداوندی کی راہ سے قطعاً مختلف تھی جو بدر و حنین اور قادسیہ و یرموک کے میدانوں سے گزرتی ہے۔ ان راہوں میں خط امتیاز کھینچتے ہوئے اقبالؒ نے برملا کہا۔

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل ۔۔۔ یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست ۔۔۔ یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اقبال کی دعوتِ انقلاب قدم قدم پر اس مذہبِ مُلّا کے خطرات کی نشان دہی کرتی چلی گئی اور اس سلسلے میں اس نے جو کچھ کہا اس کے لئے سینکڑوں صفحے درکار ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ یا تو اس ذہنیت میں تبدیلی پیدا ہو یا پھر یہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جائے۔ جب تک اس کی کارفرمائی باقی ہے اس وقت تک نہ تو ملت کی بگڑی سنور سکتی ہے اور نہ کارگر

حیات میں زندگی کے تقاضوں کو مردانہ وار پورا کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے نئی نسل کو یہ دعوت پیکار دی تھی کہ۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم ۔ قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر ۔ کہ دل در سینۂ مُلّا گدازیم

اگر ذہن ملا میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی تو پھر امت کی بگڑی بنانے کے خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتے۔ یہ تھا اقبال کی دعوت انقلاب کا وہ گوشہ جسے دینی انقلاب کے بلند و بالا مقاصد میں ہمیشہ پیش نظر رکھنا پڑے گا اور اگر ملت اسلامیہ اس خطرے کے نتائج و عواقب کو نظر انداز کرتی ہے تو اسے لازماً مایوسیوں اور نامرادیوں سے دوچار رہنا ہوگا۔ ملّا سے نجات ہمیشہ دینی انقلاب کا پہلا قدم قرار پائے گا۔ اقبال نے کس قدر درست کہا تھا کہ

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را　　　بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند　　　کہ مُلّا کم شناسد رمزِ دیں را

طلوعِ اسلام کا آئندہ شمارہ

طلوع اسلام کنونشن ماہ اپریل میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس لئے طلوع اسلام کا اگلا پرچہ (مئی - جون کا مشترکہ شمارہ) کنونشن نمبر کی حیثیت سے منظر اشاعت پر آرہا ہے۔ اس کی ضخامت عام شماروں سے دوگنی ہوگی اور اس میں کنونشن کی روئیداد، خطابات رپورٹیں اور دیگر اہم مقالات شامل ہوں گے۔ کوشش کی جائے گی کہ یہ اہم شمارہ وسط مئی تک شائع ہو جائے۔ مستقل خریدار، ایجنسیاں اور عام قارئین اسے نوٹ فرمالیں۔

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

علامہ السید احمد السیفی
ترجمہ سید نصیر شاہ میانوالی

ذیل کا مضمون علامہ السیفی کے مقدمہ تفسیر القرآن کے ایک ذیلی عنوان "جمع القرآن" کا ترجمہ ہے۔ اسی باب "جمع القرآن" کو علامہ موصوف نے "تدوین حدیث" والے گراں قدر مقالہ کے ساتھ شامل کر کے الگ کتابی صورت میں بھی شائع کیا ہے جس کا نام ہے "قولٌ فصلٌ فی تدوین الکتاب والحدیث"۔ مقدمہ تفسیر میرے سامنے نہیں۔ میں نے اسی کتاب سے ترجمہ کیا ہے۔ (مترجم)

[حدیث کے سلسلہ میں یہ اہم سوال ہمیشہ سامنے آتا ہے کہ اگر احادیث، دین کا مستقل حصہ تھیں، اور ان پر عمل کرنا امت کے لئے اسی طرح واجب تھا جس طرح قرآن پر عمل کرنا، تو یہ چیز نبی اکرمؐ کے فریضۂ رسالت میں داخل تھی کہ حضورؐ اپنی احادیث کا مجموعہ مرتب کرا کر امت کو دے کر جاتے۔ لیکن حضورؐ نے ایسا نہیں کیا۔ جس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ کا یہ منشا نہیں تھا کہ وہ امت کے لئے واجب الاطاعت ہوں۔ اس سوال کا جواب ہمارے قدامت پرست طبقہ کے پاس کچھ نہیں تھا ـــــ نہ ہی کسی نے آج تک اس کا کوئی معقول جواب دیا ہے۔ لیکن بڑے دھڑلے سے کہا یہ گیا کہ نبی اکرمؐ نے قرآن بھی امت کو مرتب شکل میں نہیں دیا تھا۔ یہ جواب جس قدر افسوسناک ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔ لیکن طلوع اسلام نے اس پر اظہار تاسف کو کافی نہ سمجھا بلکہ اس سوال کی اہمیت کے پیش نظر اس پر تفصیلی بحث کی اور خود قرآن کریم اور تاریخ سے ثابت کیا کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو مکمل اور مرتب شکل میں امت کو دیا تھا۔

اور جو قرآن اس وقت ہمارے پاس ہے وہ حرفاً حرفاً وہی ہے اور اسی ترتیب میں ہے جسے حضورؐ نے امت کو دیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی ہم نے یہ بھی بتایا کہ روایات کی رو سے قرآن کریم کی کس قسم کی شکل سامنے آتی ہے۔ یہ تفصیلی مضمون، پہلے طلوع اسلام کی نومبر سنہ ۱۹۵۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا اور اس کے بعد مقام حدیث (جلد دوم) میں نقل کیا گیا۔

جب یہ حضرات خدا کی کتاب عظیم کو اس طرح (معاذاللہ) ترک نہ کر سکے تو یہ شوشہ چھوڑا گیا کہ جس زمانے میں قرآن کریم کی کتابت ہوئی تھی، اس وقت ابھی عربی زبان میں نقطے ایجاد نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے قرآنی الفاظ نقطوں کے بغیر لکھے گئے تھے۔ عرب آیات قرآنی کو اٹکل سے پڑھتے تھے لیکن اس کی وجہ سے بہت سے اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ نیز یہ بھی کہا گیا کہ قرآنی آیات جس شکل میں مروجہ قرآن کریم میں لکھی ہوئی ہیں، یہ اس سے مختلف شکلوں میں بھی نازل ہوئی تھیں۔ اسے اختلافات قرأت کہتے ہیں۔ طلوع اسلام نے ان گمراہ کن نظریات کی بھی تردید کی۔ (اس ضمن میں طلوع اسلام بابت اپریل سنہ ۱۹۵۹ء اور نومبر سنہ ۱۹۵۹ء ملاحظہ فرمایئے۔)

مصر کے علامہ سیفی صاحب کے چند ایک مضامین اس سے پہلے طلوع اسلام میں شائع ہو چکے ہیں۔ ہم نے اس سے پہلے علامہ مذکور کا کوئی مضمون دیکھنا تو درکنار، ان کا نام تک بھی نہیں سنا تھا اور ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے بھی طلوع اسلام یا اس کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن ان کے مضامین سے آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہ کس طرح طلوع اسلام کی طرف سے پیش کردہ قرآنی فکر سے ہم آہنگ ہیں۔ ان کا زیر نظر مضمون بھی اسی حقیقت کا مؤید ہے۔ جن حضرات نے طلوع اسلام میں شائع شدہ (مذکورہ صدر) مضامین کا مطالعہ کیا ہے وہ محسوس کریں گے کہ علامہ سیفی کا یہ مضمون اُن مضامین سے کس قدر مشابہ ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب قرآن کریم کا مطالعہ خالی الذہن ہو کر کیا جائے تو انسان ایک ہی نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ ہمیں دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ قرآنی فکر کو عام کرنے کی تحریک، مصر میں بھی پیدا ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی تعلیم اور نظام پھر سے عام ہونے کا زمانہ بہت قریب آ رہا ہے۔ اور ہر چشم بینا دیکھ رہی ہے کہ

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے　　　یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

—— طلوع اسلام

رجعت پسندوں نے ہمارے خلاف جو محاذ قائم کر لیا ہے ہم اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ فی الحقیقت وہ محاذ ہی کہاں ہے۔ وہ تو ایک "چڑیا خانہ" ہے جس سے مختلف قسم کی ناقابل فہم، غیر مدلل اور جذباتیت میں ڈوبی ہوئی آوازیں بلند ہو رہی ہیں ہر فرقہ یہی کہتا ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن ناقابل فہم ہے۔ مگر جب ان سے پوچھا جائے کہ حدیث کون سی؟ تو پہلے وہ سراسیمگی کے عالم میں ایک دوسرے کا منہ تکتے ہیں۔ پھر شیعہ کہتے ہیں حدیث وہی جو ہمارے فرقہ کے نزدیک صحیح ہو۔ اہل حدیث کہتے ہیں شیعوں کی روایات کا کیا اعتبار۔ معتبر احادیث تو ہمارے ہی پاس ہیں۔ حنفی کہتے ہیں ایسا نہیں۔ حدیث وہی ہے جسے ہمارے ائمہ نے قبول کیا اور ہر وہ آیت یا حدیث جو ہمارے ائمہ کے اقوال کے خلاف ہو یا تو مؤول ہے یا منسوخ[1]۔ غرضیکہ ہر فرقہ انہی احادیث کی طرف کھینچتا ہے جو اس کے نزدیک صحیح ہوں۔ لہٰذا جب صورت حال یہ ہو تو ایسے اہمیت دیکر جوابات قلم بند کرنے بیٹھنا تحصیل حاصل ہے۔

قرآن پر اعتراض
مختلف فرقوں کا متحدہ کارنامہ

ہاں ان مختلف فرقوں نے ایک متحدہ نعرہ بلند کیا ہے جس کی اہمیت کو ہم نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ سوال آگیا ہے قرآن حکیم کے تحفظ کا۔ اور ایسے موقع پر ہمارا قلم رکھ کر بیٹھ جانا ہمارے نزدیک کفر ہے۔ اگرچہ قرآن حکیم پر یہ تیر اپنوں کی طرف سے ہی چلائے جا رہے ہیں مگر ہم سینہ سپر ہیں۔ چاہے بیگانوں نے تیر چلانے کے لئے چلّے جوڑے ہوں۔ چاہے اپنوں کی کمانیں دوہری ہوئی ہوں۔ اب ذرا کلیجہ تھام کر سنئے کہ یہ حضرات کس ہتھیار سے اپنے بدن پر سجا کر میدان میں اترے ہیں۔

ہم نے کہا تھا کہ حدیث اگر ایسی ہی ضروری چیز ہوتی تو رسول خدا صلعم نے اسے کتابی شکل میں امت کے حوالہ کیا ہوتا تاکہ بعد میں کسی قسم کے اختلافات رونما ہوتے اور کوئی بدطینت احادیث میں کمی بیشی نہ کر سکتا۔ اس کے جواب میں مختلف فرقوں نے یہ متحدہ آواز اٹھائی ہے کہ "اگر ایسی بات ہے تو حضورؐ نے قرآن ہی کب کتابی شکل میں امت کے حوالہ کیا تھا۔ قرآن بھی تو بعد میں جمع کیا گیا۔" لیجئے قصہ تمام ہوا۔ حدیث تو حدیث، اب قرآن بھی مشکوک ٹھہرا۔ اٹھے تھے یہ حضرات ظنی چیز کا تحفظ کرنے، اور یقینی کو بھی ظنی قرار دے بیٹھے۔ کاش اسلام کے یہ نادان دوست غور و تامل سے قدم اٹھانے کے خوگر ہوتے۔ بچے کے ہاتھ میں تلوار دے دی جائے تو یہی نتائج برآمد ہوتے ہیں لیکن ہمیں چاہیئے کہ انہیں طعنہ دینے کی بجائے ان کے سوال کی طرف متوجہ ہوں انہوں نے تو بے سوچے سمجھے وار کر دیا۔ اب ہمیں اپنی تلواروں کو بلند کرنا چاہیئے تاکہ ان کی تلوار کے قرآن تک پہنچنے سے پہلے اس کی دھار کو کند کر دیں اور سچ یہ ہے کہ ہماری تلواروں کی کاٹ وہ بارہا دیکھ چکے ہیں ؎

صبرنا له في نهكها ومصابها بأسيافنا حتى يبوخ سعيرها (حاتم طائی)

(ہم نے ان کے تمام آفات و شدائد کے مقابل میں اپنی تلواروں سے استقلال دکھایا حتیٰ کہ وہ ٹھنڈے پڑ گئے)

---

[1] یہ علامہ کرخیؒ کا قول ہے۔ دیکھئے خضری کی تاریخ فقہ الاسلامی۔ (سیفی)

ہمارا دعویٰ ہے کہ نبی صلعم نے قرآن حکیم اسی مرتب صورت میں امت کے حوالہ کیا تھا۔ اس دعویٰ کو ثابت کرنے کے لئے ہم مختلف ذیلی عنوانات کے تحت عقلی و نقلی دلائل مہیا کریں گے۔ ان ذیلی عنوانات کو خاص طور پر ذہن میں رکھئے گا کیونکہ یہ اگلے مباحث میں بہت کام آئیں گے اور ہم جابجا ان کی طرف اشارات کریں گے۔

عربی خط کی ایجاد

بعض جدت پسند مؤرخین کا خیال ہے کہ عربی خط کا ماخذ قدیم ہیروگلیفی خط ہے جس کا رواج مصر قدیم میں تھا۔ ان کے نزدیک ہیروگلیفی خط سے خط فنیقی، اس سے خط آرامی اور اس سے عبرانی، نبطی، کلدانی، عربی وغیرہ خط مشتق ہیں۔ لیکن عام طور پر مؤرخین کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی خط سریانی خط سے نکلا ہے جسے خط سطرنجیلی بھی کہتے ہیں۔ سریانی اور عربی خط باہمدگر مشابہ ہیں۔ سریانی حروف کی ترتیب۔ ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص ہے۔ عربی میں یہ حروف اسی طرح برقرار رکھے گئے ہیں۔ صرف ۶ حروف عربی میں زائد ہیں ثخذ اور ضظغ۔ ان چھ حروف کے لئے عربوں نے جدید شکلیں ایجاد نہیں کیں بلکہ ان کے ہم مخرج حروف کی شکلیں ہی مستعار لی گئیں۔

عربی کے جن الفاظ میں "ث" آتا ہے سریانی میں ان کا تلفظ "ت" سے بدل جاتا ہے۔ "خ" کو "ح" اور "ظ" کو "ط" اور "ذ" کو سریانی میں "د" سے بدلا جاتا ہے۔ ہاں "ض" سریانی سے نہیں بلکہ عبرانی سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ عربی کے جن الفاظ میں "ض" ہے انہیں سریانی میں بدلے تو "ض" کو "ع" میں تبدیل کرتے ہیں۔ ہاں عبرانی میں "ض" "ص" سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً لفظ "قرض" ہے کہ اسے سریانی میں پڑھئے تو "قرع" ہو گا اور عبرانی میں "قرص" ہو جائے گا۔ ان چھ زائد حروف کے لئے اہل عرب نے نئی شکلیں وضع نہیں کیں بلکہ ان کے قریب المخارج الفاظ پر نقطوں کا اضافہ کر دیا۔ "ت" پر ایک نقطہ کا اضافہ کر کے "ث" بنا دیا۔ "ع" پر نقطہ کا اضافہ کر کے "غ" بنا دیا۔ "ح" پر نقطہ کا اضافہ ہوا تو "خ" ہو گیا۔ "د" کو نقطہ کے اضافہ سے "ذ" کر دیا۔ "ض" پر نقطہ آیا "ض" ہوا "ط" پر نقطہ آیا "ظ" ہو گیا۔ اس طرح عربی حروف کی تعداد تو ۲۸ ہو گئی لیکن ان کی شکلیں ۱۸ ہی ہیں۔ باہمی امتیاز کے لئے نقطے مقرر کئے گئے۔

ایک خطرناک غلطی

اس حقیقت کو ایک بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ عربی خط کے ساتھ ہی نقطے ایجاد ہوئے کیونکہ حروف اکثر ہم شکل ہیں اور نقطوں کے بغیر ان میں تمیز کرنا ناممکن ہے۔ (ب، ت، ث) (ج، ح، خ) (د، ذ) (ر، ز) (س، ش) (ص، ض) (ط، ظ) (ع، غ) وغیرہ کو آخر نقطوں کے بغیر کون سی چیز ممیز کرتی ہے۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ مسلمانوں میں کچھ ایسے "محققین" بھی ہوئے ہیں بلکہ آج بھی موجود ہیں۔ جو یہ کہتے ہیں کہ عربی خط ایجاد ہو چکا تھا۔ جاہلی شعراء اپنے سو سو اشعار کے طویل قصائد لکھ کر خانۂ کعبہ پر لٹکاتے تھے پڑھنے والے انہیں پڑھتے بھی تھے۔ لیکن حروف پہ نقطے نہیں لگائے جاتے تھے۔ یعنی ج، ح اور خ کو "ح" لکھ دیا جاتا تھا۔ ب، ت، ث تینوں کی بجائے یہ شکل (ٮ) بنا دی جاتی تھی۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ قرآن بھی پہلے پہل اسی طرح لکھا گیا۔ اس کے نزول کے پچاس سال بعد نصر بن عاصم نے

نقطے اور ابوالاسود دوئلی نے اعراب ایجاد کئے۔ بعض حضرات جو تحقیق کے میدان میں اور زیادہ کشادہ ذہن[1] واقع ہوئے ہیں کہتے ہیں کہ قرآن سنہ ھ تک لکھا تو جاتا رہا مگر اس طرح کتب الحکمت الله (کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُهٗ) خدا بھلا کرے بصرہ کے گورنر زیاد کا، کہ اس نے ابوالاسود دوئلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کی علامات بنائے (یعنی اب تک قرآن پر نہ نقطے تھے نہ اعراب) اس نے یہ علامات بنائیں کہ جو حرف مفتوح ہو اس کے اوپر نقطہ لگایا جائے جس حرف پر زیر آئی ہو اس کے نیچے نقطہ لگایا جائے اور پیش والے حرف کے اندر نقطہ ہو۔ اس عجیب و غریب روایت پر نظر رکھئے اور آپ بھی مندرجہ بالا آیت پر یہ طرز اعراب لگا دیکھئے اور اگر آپ نہ لگا سکیں تو ان محققین کو کہئے کہ وہ خود ہی یہ اعراب لگا کر دکھا دیں۔ خیر یہ تو تھا زیاد کے عہد کا واقعہ اس کے بعد یہ حضرات کہتے ہیں کہ موجودہ نقطے اور اعراب حجاج بن یوسف نے لگوائے تھے۔ ان حضرات کے متعلق ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں بجز اس کے کہ جب یہ لوگ کسی لائبریری میں مطالعہ کے لئے جاتے ہیں تو عقل کو بھی جوتوں کی طرح

---

[1] میتھی صاحب نے تو یہ "تکلف کشادہ ذہن" لکھ دیا مگر ہمارے یہاں تو ایسے محققین کو عالم اسلام کا بلند پایہ مفکر گردانا جاتا ہے۔ سنئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں: "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس رسم الخط میں ابتداءً نبی صلعم نے وحی کی کتابت کرائی تھی اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی اس کے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے بلکہ نقطے بھی نہ تھے کیونکہ اس وقت تک یہ علامات ایجاد نہیں ہوئی تھیں۔ اس رسم الخط میں پورے قرآن کی عبارت یوں لکھی گئی تھی۔ کتب احکمت اىىه ىم فصلت من لدن حكىم خىىر۔ اس طرز تحریر کو اہل زبان اٹکل سے پڑھ لیتے تھے اور بہرحال با معنی بنا کر ہی پڑھتے تھے لیکن جہاں مفہوم کے اعتبار سے متشابہ الفاظ آ جاتے یا زبان کے قواعد محاورہ کی رو سے ایک لفظ کے کئی تلفظ یا اعراب ممکن ہوتے وہاں خود اہل زبان کو بکثرت التباسات پیش آ جاتے تھے اور تعیین کرنا مشکل ہو جاتا تھا کہ لکھنے والے کا اصل منشا کیا ہے ... پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن میں اعراب لگانے کی ضرورت سب سے پہلے بصرہ کے گورنر زیاد نے محسوس کی جو سنہ ۴۵ھ سے سنہ ۵۳ھ تک وہاں کا گورنر رہا تھا۔ اس نے ابوالاسود دوئلی سے فرمائش کی کہ وہ اعراب کے لئے علامات تجویز کریں اور انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مفتوح حرف کے اوپر، مکسور حرف کے نیچے اور مضموم حرف کے بیچ میں ایک ایک نقطہ لگا دیا جائے۔ اس کے بعد عبدالملک بن مروان کے عہد حکومت میں حجاج بن یوسف والی عراق نے دو علماء کو اس کام پر مامور کیا کہ وہ قرآن کے متشابہ حروف میں تمیز کرنے کی کوئی صورت تجویز کریں چنانچہ انھوں نے پہلی مرتبہ عربی زبان کے حروف میں بعض کو منقوط اور بعض کو غیر منقوط کر کے اوپر یا نیچے ایک سے لے کر تین تک نقطے لگا کر فرق پیدا کیا اور ابوالاسود کے طریقہ کو بدل کر اعراب کیلئے نقطوں کے بجائے زیر، زبر، پیش کی وہ حرکات تجویز کیں جو آج مستعمل ہیں۔" (ترجمان القرآن ج ۲ ص جولائی سنہ ۵۱ء) مولانا موصوف کی اس علمی و تاریخی تحقیق کو پڑھئے جو انہوں نے مطلق سے پیش کی ہے اور پھر عالم اسلام کے افلاس فکر پر ماتم کیجئے کہ آج وہ عالم اسلام کے بلند پایہ مفکر ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (طلوع اسلام)۔

اتار کر باہر رکھ دیتے ہیں اور پھر جو کچھ رطب و یابس کتابوں میں ملتا ہے اسے نقل کر کے ان کی تحقیق مکمل ہو جاتی ہے حالانکہ قدماء انسان تھے اور جو کچھ ان کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے وہ خطا و نسیان سے پاک نہیں۔ جس طرح ہم پہلے کہہ چکے ہیں کوئی صاحب عقل و شعور اگر ذرا سا غور بھی کرے تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ عربی کے ہم شکل حروف کی تمیز کا واحد ذریعہ صرف نقاط ہی ہیں۔ مستند تاریخی روایات بھی ہمارے اس بیان کی تصدیق کرتی ہیں۔ ابوالفرج محمد بن الندیم لکھتے ہیں۔

"حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے عربی رسم الخط کی بنیاد ڈالی وہ انبار کے باشندے اور قبیلہ بولان سے تعلق رکھنے والے تین شخص تھے۔ مرامر بن مرہ، اسلم بن سدرہ اور عامر بن جدرہ۔ مرہ کو بعض نے مروہ اور جدرہ کو جدلہ بھی کہا ہے لیکن مرامر، اسلم اور عامر کے ناموں میں کوئی اختلاف نہیں۔ مرامر نے حروف کی صورتیں متعین کیں۔ اسلم نے ان کے جوڑ لگائے اور علیحدگی کی شکلیں قائم کیں۔ عامر نے ان پر نقطے لگائے۔" (کتاب الفہرست مطبوعہ مصر ص۶[۱])

اس طرح سے سوچئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ عربی خط اسلام سے پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا۔ علامہ ابن خلدون لکھتے ہیں۔

"حکومت تبابعہ کے عہد میں (نزول قرآن سے بہت عرصہ پیشتر) جب تمدن و شائستگی نے آنکھ کھولی اور شہروں کی آبادی بڑھ گئی اس وقت یمن میں عربی خط مکمل ہو چکا تھا اس خط کو خط حمیری کہتے ہیں۔ تبابعہ کے بعد آل منذر یعنی سلاطین حیرہ نے اس خط کو رواج دیا اور خط حمیری حیرہ میں منتقل ہوا۔ حیرہ کے باشندوں سے مکہ کے قریشی تاجروں اور اہل طائف نے یہ خط سیکھا۔"

(مقدمہ ابن خلدون فصل ۳۰)

یہ حمیری خط کیسا تھا؟ اگر یہ تفصیل مطلوب ہو تو ابن ندیم کی متذکرہ بالا کتاب "الفہرست" کا ص۶ دیکھئے جس پر حمیری حروف تہجی کی تصاویر دی گئی ہیں۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ خط حمیری میں نقطے موجود ہیں۔ جہاں نقطے موجود نہیں وہاں کچھ ایسی علامات دی گئی ہیں جن کی مدد سے حروف کے تعین میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اور ہاں اس نظریہ میں ہم منفرد نہیں۔ بلکہ محققین ہمارے ساتھ ہیں۔ چنانچہ مشہور نحوی علامہ ابوالفتح عثمان بن جنی بھی یہی کہتے ہیں کہ

سه رمتنی بسہم نقطت منہ حبتی   واذ نقطت عین "تذرف" کالغین

(محبوبہ نے مجھے تیر مارا اور میرے پہلو پر جیسے نقطے کی طرح زخم ہو گیا اور جب کسی آنکھ (عین) پر نقطہ کی طرح زخم پڑتا ہے تو وہ بادل (غین) کی طرح اشک برساتی ہے)۔

اس شعر میں ایک تو نقطے کا لفظ موجود ہے حالانکہ ہمارے مخاطب علماء کہتے ہیں کہ اس زمانے میں "نقطہ" کے لفظ سے بھی کوئی

[۱] بخوف طوالت عربی عبارات حذف کر دی گئی ہیں۔ ہر اقتباس کے ساتھ کتاب کا حوالہ موجود ہے کسی کو ضرورت ہو تو اصل کتاب دیکھ لے (مترجم)

ہستانا تھا۔ دوسرے متذکرہ شعر میں نقطہ پڑجانے سے "عین" اور "غین" کا لطیف استعارہ بھی پیش کیا گیا ہے دوسرا شعر ہے سہ

أم النجوم تعرضت فی سقفها ... أم أنجموا لو عابا لغير حروف

(یہ آسمان کی چھت پر ستارے بکھرے ہوئے ہیں یا کسی نے حروف کے بغیر صفحۂ سادہ پر نقطے لگا دیئے ہیں۔ (امالی لابن ظفر صہ ۲۲)

اس شعر میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ نقطے تو حروف پر ہوتے ہیں مگر ستارے آسمان پر اس طرح معلوم ہوتے ہیں جیسے کسی نے سادہ صفحے پر نقطے بکھیر دیئے ہوں۔ علامہ فرید لکھتے ہیں۔

"یہ روایت کہ عربی کا فن کتابت پہلے نامکمل تھا اور نزولِ قرآن کے چالیس پینتالیس سال بعد مکمل ہوا۔ اور اس پر نقطے لگائے گئے بہت تو بڑی مشہور، لیکن ہے بالکل بے بنیاد۔ کیونکہ عربی کے ہم شکل حروف اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جس روز سے فنِ کتابت وضع ہوا اس روز سے مماثل حروف کی باہمی تمیز کے لئے نقطے لگائے گئے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مکہ کے تاجروں نے اہلِ حیرہ سے فنِ کتابت سیکھا تھا۔ اب آپ سوچئے کہ جو خط تجارتی اغراض و مقاصد کیلئے استعمال ہوا ہوگا کیا وہ اس قدر نامکمل ہوگا کہ عبارت صحیح طور سے پڑھی بھی نہ جا سکے۔ عربی الفاظ کو تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ان میں ذرا سی کمی بیشی ہو جائے تو بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ اس لئے ذہنِ سلیم یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ تجارتی خطوط ایسی تحریر میں لکھے جاتے ہوں۔ جنہیں پڑھنا ناممکن ہو۔ پس حق یہ ہے کہ ان حروف پر پہلے دن سے ہی نقاط لگائے گئے۔"

(ام الالسنہ صہ ۶۳)

علامہ رضا اصفہانی فرماتے ہیں :۔

بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ عربی زبان کی کتابت جب شروع ہوئی تو پہلے نقطے نہ تھے یہ نقطے ابو الاسود دوئلی یا اس کے بھی بعد حجاج کے عہد میں لگوائے گئے۔ یہ بات سراسر غلط ہے کیونکہ عربی حروف کا ہم شکل ہونا اس امر کی قطعی دلیل ہے کہ یہ نقطے اول روز سے ہی لگائے گئے ہوں گے۔ ہاں بعض لوگوں کا طریقہ ہوتا ہے کہ معروف الفاظ پر نقطے نہیں لگاتے مثلاً "من" ہے کہ اس کے "ن" پر نقطہ نہ لگائیے تو بھی "من" ہی پڑھا جائے گا یا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہے کہ اپنی شہرت اور زبان زد خاص و عام ہونے کی وجہ سے اس جملے کے کسی حرف پر بھی اگر نقطہ نہ ہو تو صحیح پڑھ لیا جاتا ہے اسی طرح اور بھی کئی جملے ہو سکتے ہیں۔ پس اگر ایسی عبارات پر نقطے نہ ہوں تو وہ اس بات پر دال نہیں کہ

عربی حروف پر نقطے تھے ہی نہیں۔ ابن ندیم نے خط حمیری کی جو نقل پیش کی ہے اس پر نقطے موجود ہیں "

(تاریخ اللسنہ ج ۴ ص ۱)

ہمارا خیال ہے کہ ان حضرات کا اطمینان ہو چکا ہوگا جو سراسر غلط اور بے بنیاد دعاوی پیش کر کے خواہ مخواہ قرآن حکیم کو مشتبہ ٹھہرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اس بحث میں زیادہ نہ الجھنا چاہیئے۔ ہاں تو یہ تھی عربی زبان کی کتابت کی ابتدا کہ اس میں نقطے موجود تھے۔ اس بحث کو یہیں چھوڑ کر اب ہم قرآن حکیم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس سلسلے میں ہم سب سے پہلے قرآن حکیم کی اندرونی شہادتیں پیش کریں گے پھر روایات اور پھر محققین کی آراء۔ خیال یہ ہے کہ روایات کو ہم تاریخ کی حیثیت دیتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جو روایت قرآن کے مطابق ہو وہ درست ہے اور جو اس کے مخالف ہو وہ غلط ہے۔

کتابت کا لغوی مفہوم

علامہ ابن فارس کہتے ہیں۔

"کتاب دراصل تو ہے کے اس چھلے کو کہا جاتا تھا جو عرب اونٹنیوں کی شرمگاہوں پر ڈال دیتے تھے تاکہ وہ کسی گھٹیا نسل کے اونٹ سے حاملہ نہ ہوں "

(مقائیس اللغۃ حرف ک)

علامہ محب الدین مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں۔

"کتاب ایک تو اس چھلے کو کہتے تھے جو شرمگاہ پر ڈالا جاتا تھا دوسرے اس چھلے کو جو اونٹنی کے نتھنوں کو باہم سی دیتا تھا تاکہ وہ اپنے بچے کو سونگھ کر دودھ نہ پلا دے "

(تاج العروس شرح قاموس)

ان بنیادی معنوں پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ "کتب" کا مفہوم ہے کسی چیز کو محفوظ کر دینا۔ مشکیزہ یا بوری کے منہ کو سی دینا اور بند کر دینا بھی "کتب" کے مفہوم میں شامل تھا یعنی اس طرح محفوظ کر دینا کہ نہ اندر کی چیز باہر جا سکے اور نہ باہر کی چیز اندر آ سکے۔ کتاب عربی میں بھی چونکہ چند اوراق کو باہم ملا کر چھلا ڈال دیا جاتا تھا اس لئے اسے بھی کتاب کہنے لگے۔ نیز چونکہ "کتب" میں بند کرنے اور محفوظ کر دینے کا مفہوم پنہاں تھا اور جو چیز لکھ لی جائے وہ بھی ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جاتی ہے اس لئے لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہنے لگے۔

کتابت کی اہمیت

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ کتابت کا مفہوم ہے اس طرح محفوظ اور بند کر دینا کہ نہ باہر کی چیز اندر جا سکے نہ اندر کی چیز باہر جا سکے۔ اب علمی دنیا میں معروف کتابت (لکھنا) کی اہمیت آپ کی سمجھ میں آ گئی کہ جو علم لکھ لیا جائے وہ کمی یا بیشی سے بچ گیا۔ اور محفوظ ہو گیا۔ اسی لئے اہل عرب کہتے ہیں العلم صید والکتابۃ قید (علم شکار ہے اور اسے لکھ لینا اسے قید کر لینا ہے) آپ جانتے ہیں کہ جو علوم یقینی ہم

تک پہنچے وہ تمام لکھے ہوئے ہی تو تھے۔ آپ لاکھ کہتے رہیئے محض زبانی باتوں اور حافظہ کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

قرآن اور کتابت اب یہ دیکھئے کہ قرآن نے کتابت کو اہم سمجھا ہے یا نہیں۔ جب آپ اس طرف توجہ کرینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن حکیم نے کتابت کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ روایات کے مطابق سب سے پہلے جو وحی نازل ہوئی اس میں اللہ نے ارشاد فرمایا۔

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (۹۶/۳-۵)

اے پیغمبرؐ! پڑھ اور تیرا رب نہایت ہی کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔ اور اس طرح وہ چیز انسان کو سکھائی جو اسے معلوم نہیں تھی۔

عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ کے ٹکڑے کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ علم ہے ہی وہی جو قید کتابت میں آجائے۔ سوچئے کہ جو خدا اپنے رسولؐ کو پہلے ہی پیغام میں قلم کی اہمیت جتلا دے کیا اس کی اپنی کتاب قید کتابت میں نہیں لائی جائے گی۔ دوسری جگہ ہے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۶۸/۱)

قسم ہے قلم کی اور اس کی جو کچھ وہ لکھتے ہیں۔

اس آیت میں قلم کی قسم کھا کر گویا اسے اپنی شہادت میں پیش کیا گیا ہے اور اسی طرح کتاب مسطور کو بھی اپنا گواہ ٹھہرایا گیا ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اور کس طرح کتابت کی اہمیت واضح کی جا سکتی تھی۔ اسی طرح تجارت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام دیئے ہیں اس میں کتابت کو ضروری قرار دیا ہے ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ (۲/۲۸۲)

اے مسلمانو جب کبھی آپس میں قرض کا لین دین میعاد مقررہ تک کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔

یہ تو ہوا حکم۔ جسے آپ تجارتی معاملات سے مخصوص قرار دے سکتے ہیں لیکن اس کے بعد اس حکم کی جو علت بیان کی گئی ہے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ قرآن کی نگاہ میں جو بات لکھی ہوئی نہ ہو وہ نہ صحیح تر ہے نہ شہادت کو مستحکم کرنے والی ہے اور نہ شک و شبہ سے بالاتر ہے ارشاد ہے۔

وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا (۲/۲۸۲)

معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا لیکن اس کی میعاد تک اسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو۔ یہ کتابت اللہ کے

نزدیک صحت کی بڑی ضمانت اور گواہی کے لئے بہت مستحکم ہے اور یہ اس بات کے بہت قریب کہ تم شک وشبہ میں نہ پڑو۔

دیکھئے کس وضاحت سے کہا جا رہا ہے کہ کتابت اللہ کے نزدیک بہت زیادہ قرین عدل، گواہی کو مضبوط رکھنے والی اور اس بات کے نزدیک ہے کہ لَا تَرْتَابُوْا۔ (تم ریب میں نہ پڑو) گویا جو چیز لکھی ہوئی نہ ہو محض زبانی روایات پر منحصر ہو وہ "ریب" میں ڈالنے والی ہے اور "ریب" (شک وشبہ) اس چیز میں نہیں ہوتا جو لکھ لی جائے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس کے سرنامہ پر ہی یہ آیت کندہ کر دی کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (یہ وہ عظیم الشان کتاب ہے جس میں ریب نہیں)

قرآن کتاب ہے

کتابت کی اس اہمیت پر غور کرنے کے بعد اب یہ سوچئے کہ اللہ نے قرآن کو بیشتر مقامات پر کتاب کہا ہے مثلاً کہیں قرآن کو صرف کتاب کہا گیا ہے ملاحظہ ہو [illegible]، کہیں کتاب مبین دیکھئے [illegible]، کہیں الکتاب بالحق دیکھئے [illegible]، کہیں الکتاب مفصلاً دیکھئے [illegible]، کہیں کتب انزلناہ مبارک دیکھئے [illegible]، کہیں الکتاب الحکیم دیکھئے [illegible]، کہیں الکتاب لاریب فیہ [illegible]، کہیں کتاب احکمت آیتہ دیکھئے [illegible]، کہیں کتب عزیز دیکھئے [illegible]، کہیں الکتاب تبیاناً لکل شیٔ دیکھئے [illegible]۔ غرضیکہ مختلف مقامات پر قرآن حکیم نے اپنے آپ کو کتاب کہا ہے۔ یہیں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن اپنے نزول کے ساتھ کتابی صورت اختیار کر رہا تھا یعنی ایک تو اسے لکھا جاتا تھا کیونکہ جو باتیں زبانوں پر ہوں انہیں کتاب نہیں کہا جا سکتا۔ دوسرے جن اوراق پر قرآن لکھا جاتا تھا وہ منتشر اوراق نہ تھے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آیا ہے بلکہ ان کی شیرازہ بندی کر کے انہیں یکجا کیا گیا تھا۔ کیونکہ کتاب کے بنیادی مفہوم میں یکجا کرنا، جلد ڈال دینا، شیرازہ بندی کرنا بھی شامل ہے۔

نزول قرآن کے بعد حضورؐ لکھ پڑھ سکتے تھے

آپ دیکھ چکے ہیں کہ سرور کائنات صلعم کی طرف جو پہلا پیغام آیا تھا اس میں "علم بالقلم" کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا اس لئے لازماً جناب آقائے انسانیت صلعم نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہوگا کیونکہ قرآن حکیم شاہد ہے سورۂ عنکبوت میں ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ (۲۹/۴۸)

اور آپ نزول قرآن سے پیشتر نہ تو کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے نہ اپنے دائیں ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔

اس آیت میں مِنْ قَبْلِهٖ کے الفاظ صاف طور پر گواہی دے رہے ہیں کہ نزول قرآن سے پہلے آپ لکھنے پڑھنے سے عاجز

تھے اور نزول قرآن کے بعد آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ کیونکہ اگر نزول قرآن کے بعد بھی حضورؐ اس چیز سے عاجز ہوتے تو "من قبلہ" کا لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اگر حضورؐ بعض لوگوں کے قول کے مطابق آخر عمر تک کتابت و تلاوت سے ناآشنا ہے تو قرآن "من قبلہ" کا لفظ کیوں لگاتا۔ پھر روایات سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نزول قرآن کے بعد لکھ پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کی مشہور روایت ہے کہ جب صلحنامہ مرتب ہونے لگا تو آپؐ نے حضرت علیؓ سے ارشاد فرمایا "لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم"۔ کفار کے وکیل سہیل نے کہا "ہم رحمٰن کو نہیں جانتے"۔ "باسمک اللھم" لکھا جائے۔ اس پر مسلمان کہنے لگے "ہم تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہی لکھوائیں گے"۔ آپ نے فرمایا کوئی بات نہیں باسمک اللھم ہی لکھ دو۔ آگے لکھو ہذا ما قاصد علیہ محمدؐ رسول اللہ و القریش (یہ صلحنامہ محمدؐ رسول اللہ اور قریش کے مابین ہے) حضرت علیؓ نے لکھا تو سہیل نے کہا ہم محمدؐ رسول اللہ کو نہیں جانتے ہم تو محمد بن عبد اللہ کو جانتے ہیں اس لئے رسول اللہ کو کاٹ کر محمد بن عبد اللہ لکھو۔ حضورؐ نے مسکرا کر فرمایا کوئی بات نہیں۔ میں محمدؐ رسول اللہ بھی ہوں اور محمدؐ بن عبد اللہ بھی۔ اس لئے اے علیؓ! رسولؐ اللہ کا لفظ کاٹ کر ابن عبد اللہ لکھ دو۔ حضرت علیؓ نے کہا۔ میں تو کبھی رسولؐ اللہ کے لفظ کو محو نہیں کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے ان سے کاغذ لے لیا اور رسولؐ اللہ کے الفاظ کاٹ کر ابن عبد اللہ لکھ دیا۔ یہ روایت تاریخ کی تقریباً تمام کتابوں میں آئی ہے اور اگر یہ روایت اور اس جیسی دیگر روایات نہ بھی ہوتیں تو بھی قرآن کی متذکرہ بالا آیت اس امر پر صریح دلیل ہے کہ حضورؐ نزولِ قرآن کے بعد لکھ پڑھ سکتے تھے چاہے بعض خوش اعتقادوں کے اقوال کے مطابق بطور اعجاز آپ کو لکھنا پڑھنا آ گیا ہو یا آپؐ نے کسی سے سیکھا ہو مگر یہ بہر حال حقیقت ہے کہ آپ نزولِ قرآن کے بعد لکھ پڑھ سکتے تھے۔

مکہ میں تعلیم کا رواج

ہم یہ پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حجاز کے تاجروں نے اہل حیرہ سے فن کتابت سیکھا تھا۔ قدیم مورخین کا خیال تھا کہ مکہ میں سب سے پہلے حضرت ابو سفیان نے کتابت سیکھی تھی لیکن اب جناب عبد المطلب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ایک تحریر بھی ملی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابو سفیان سے پیشتر عبد المطلب بھی لکھنا جانتے تھے۔ اور ممکن ہے آیندہ کوئی علمی انکشاف عبد المطلب سے بھی پیشتر کا سراغ دے سکے۔ خیر بہر حال نزولِ قرآن کے وقت مکہ میں تعلیم کا رواج تھا بلکہ یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھیں۔ حضرت عمرؓ زمانۂ جاہلیت میں ہی کتابت سے آشنا تھے۔ مدینہ کے لوگ بھی فنِ کتابت سے واقف تھے۔ چنانچہ سعد بن عبادہ۔ منذر بن عمرو۔ اسید بن حضیر، رافع بن مالک، اوس بن خولی، اسعد بن الربیع، ابو عبس بن جبر، ابو الاردار، حنظلہ، ابی بن کعب، عبد اللہ بن زید وغیرہم، زمانۂ جاہلیت میں بھی فن کتابت کے ماہرین شمار کئے جاتے تھے۔ نزولِ قرآن کے بعد حضورؐ نے کتابت سکھانے کے لئے جو اہتمام فرمایا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ سو جبکہ جب کتابت کو قرآن اس قدر اہمیت دے چکا ہو تو کیا قرآن لکھا نہیں جاتا تھا۔

نزولِ قرآن کے وقت کاتبین آیات لکھ لیتے تھے

اس عنوان کے تحت ہم یہ ثابت کریں گے کہ قرآن کی کوئی آیت جس وقت نازل ہوتی تھی۔ کاتبینِ وحی اسے اسی وقت لکھ لیتے تھے۔ قرآن حکیم میں ہے۔ وَقَالُوا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلَىٰ عَلَيْهِ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ (۶-۵/۲۵)

مشرکین کہتے ہیں کہ قرآن اس کے سوا کیا ہے کہ پچھلے لوگوں کی کہانیاں ہیں جو اس نے اپنے دل سے گھڑلی ہیں اور وہی صبح شام اس کے سامنے املا کرائی جاتی ہیں۔ اے نبیؐ آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو اس خدا نے نازل کیا ہے جو زمین آسمان کے بھیدوں سے واقف ہے۔

اگر "اکتتب" کا عام مفہوم لیا جائے جو مشہور مستشرق بستانی نے محیط المحیط میں درج کیا ہے (اکتتب کے معنی ہیں اس نے کتاب کو خود لکھا اور دوسرے سے املا کی خواہش کی محیط المحیط ج ۲ صفحہ ۱۷۸۵) تو آیت مذکورہ العدر کا مفہوم یہ ہوگا کہ حضورؐ وحی کو پہلے خود لکھ لیتے تھے اور پھر دوسرے کاتبین کو املا کروا دیتے تھے لیکن میں امام راغب اصفہانی کا مفہوم درست خیال کرتا ہوں انہوں نے لکھا ہے کہ "اکتتب" کے معنی ہیں اپنے دل سے گھڑ لینا۔ اگلی آیت جو کفار کی بات کے جواب میں آئی ہے وہ بھی اسی مفہوم کی تائید کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں کہا گیا ہے کہ یہ آیات اللہ عالم السرائر و الخفایا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں یعنی نبیؐ نے اپنی طرف سے نہیں گھڑلی ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ کفار کا اعتراض ہے اس لئے اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ہم کہتے ہیں کہ انہوں نے جو کچھ کہا اللہ نے اس کی تردید نہیں کی۔ اگر قرآن نزول کے وقت لکھا نہ جاتا تو خدا صاف طور پر کہہ دیتا کہ یہ تو لکھا بھی نہیں جاتا۔ پس اس آیت سے واضح ہے کہ جس وقت آیات کا نزول ہوتا تھا اسی وقت انہیں احاطۂ تحریر میں لایا جاتا تھا۔ کتانی نے کاتبینِ وحی کے اسمائے گرامی بھی لکھے ہیں جن کی تعداد بیالیس[1] ہے۔

مکہ میں بھی قرآن لکھا جاتا تھا

ہم نے ابھی ابھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کی آیت جس وقت بھی اترتی تھی اسی وقت اسے لکھ لیا جاتا تھا۔ ہمارا یہ دعویٰ بالکل مبنی برحقائق ہے اس کے لئے ہم صرف ایک مثال پیش کریں گے۔ آپ کو حضرت عمرؓ کے قبولِ اسلام کا واقعہ تو یاد ہوگا۔ ابھی صرف ۴۹ آدمی مسلمان ہوئے تھے کہ حضرت خباب بن الارت ایک مصحف لے کر حضرت سعید بن زید اور حضرت فاطمہ بنت الخطاب کو تعلیم دینے کے لئے ان کے گھر جایا کرتے تھے دونوں خباب بن الارت سے قرآن پڑھتے تھے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عورتوں میں بھی اس وقت تعلیم کا چرچا پھیل رہا تھا۔ نیز قرآن جس قدر نازل ہو چکا تھا وہ لکھا ہوا موجود تھا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں پڑھتے سنا

---

[1] ترا تیب الاداریہ ج ۱ صفحہ [illegible] [2] روض الانف ج ۱ صفحہ [illegible]۔

اور دروازہ کھٹکھٹایا تو انہوں نے جلدی سے قرآن کے اوراق چھپا دیئے۔ حضرت عمرؓ نے پہلے تو تشدد کیا لیکن جب ان کی بہن نے صاف کہہ دیا کہ عمرؓ! تم جسم سے روح نکال سکتے ہو لیکن دل سے ایمان نہیں نکال سکتے، تو فاروق اعظمؓ کا دل پسیج گیا۔ پھر انہوں نے قرآن پڑھا۔ دل پر رقت طاری ہوگئی اور حضورؐ کے پاس جاکر اسلام قبول کرلیا۔ اسی ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس وقت قرآن لکھا جاتا تھا یا نہیں۔

مدینہ میں بھی قرآن لکھا جاتا تھا

یہ تو تھی مکہ کی حالت۔ مدینہ میں تو اس سے بھی زیادہ اہتمام کیا گیا۔ مسلمانوں کو عَلَّمَ بِالْقَلَمِ کی دلالت النص سے معلوم ہو چکا تھا کہ قرآن کتابت کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ نیز نبی صلعم نے بدر کے اسیروں کو بھی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ انصاری بچوں کو فن کتابت سکھا دیں تو وہ ان کا فدیہ ہو جائے گا۔ حضورؐ کے اس فعل سے بھی صحابہؓ کو علم ہوگیا کہ کتابت کتنی ضروری چیز ہے اس لئے انہوں نے بہت جلد کتابت سیکھ لی۔ چنانچہ ہجرت کے بعد یہ حکم آگیا کہ مسلمان جب لین دین کا معاملہ کریں تو لکھ لیا کریں۔ سوچئے کہ جس معاشرہ کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کیا اس کے متعلق یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہاں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوگی؟ پس جس طرح مکہ میں قرآن کی آیات لکھی جاتی تھیں اس سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ مدینہ میں لکھی جاتی تھیں۔

کتاب الامام

جس وقت کوئی آیت نازل ہوتی تھی اسی وقت قرآن حکیم کے سرکاری نسخہ میں محفوظ کرلی جاتی تھی۔ اس سرکاری نسخہ کو کتاب الامام کہا جاتا تھا۔ یہ نسخہ مسجد نبوی میں ایک صندوق میں بند ستون کے پاس رکھا ہوتا تھا۔ اسی لئے اس ستون کا نام بھی اسطوانۃ المصحف پڑ گیا۔ اسی نسخہ کو دیکھ کر باقی صحابہؓ اپنے اپنے مصاحف کو مکمل کرتے تھے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت سے مروی ہے کہ "ہم لوگ حضور صلعم کے پاس بیٹھ کر اوراق سے قرآن جمع کیا کرتے تھے" (مستدرک حاکم۔ الاتقان۔ فتح البیان)۔

بعد میں یہ صندوق اٹھوا کر ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس رکھوا دیا گیا کیونکہ وہ ازواج مطہرات میں سب سے زیادہ لکھی پڑھی تھیں۔ ان کو شفا بنت عبداللہ نے لکھنا پڑھنا سکھایا تھا۔

قرآن کریم محفوظ کتاب میں لکھا ہوا موجود تھا

یہ وہ کتاب الامام ہے جسے قرآن حکیم کتاب محفوظ سے تعبیر کرتا ہے۔

فَلَآ أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ ۝ (۵۶/۷۵-۷۸)

ک روض الانف ج ۱ ص ۲۱۸۔

ش ابو داؤد ج ۲ کتاب الطب باب الرقی، تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۴۲۹

ستاروں کی گزرگاہیں اس حقیقت پر گواہ ہیں اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت عظیم شہادت ہے کہ یقیناً قرآن بڑی عظمت و شان والی کتاب ہے جو ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

پہلے ہم کتاب کی لغوی تحقیق میں بتا چکے ہیں کہ کتب کے بنیادی معنوں میں حفاظت کا مفہوم بھی شامل ہے اور حفاظت بھی ایسی کہ نہ باہر سے کوئی چیز اندر جا سکے نہ اندر سے کوئی چیز باہر آ سکے۔ اس آیت میں کتاب مکنون کے یہی معنی ہیں کہ یہ وہ محفوظ کتاب ہے جس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔ دوسری جگہ اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ○ (۴۱ / ۴۱-۴۲)

بے شک قرآن عزت والی کتاب ہے باطل اس پر نہ آگے سے حملہ کر سکتا ہے نہ پیچھے سے (یعنی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے) یہ اس خدا کی طرف سے اتاری گئی ہے جو حکمت والا اور تعریف کا مستحق ہے۔

قرآن کس چیز پر لکھا جاتا تھا

اپنے متعلق قرآن حکیم نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ وہ کس چیز پر لکھا گیا تھا؟ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ○ ۔ (سورۃ طور ــ ۱)

قسم ہے اس کتاب کی جو لکھی ہوئی ہے بڑے بڑے کشادہ جھلی والے کاغذوں پر۔

بستانی الرق کے معنی لکھتے ہیں "نرم کھال کا بنا ہوا کاغذ جو اس وقت لکھنے میں استعمال ہوتا تھا۔ (محیط المحیط ج اصفحہ) منشور کے معنی ہیں پھیلے ہوئے۔ گویا کہہ دیا گیا کہ قرآن ملاطفہ کی صورت میں نہیں لکھا گیا کہ اس کے ورق کو لپیٹ دیا جائے۔ بلکہ اس کے اوراق پھیلے ہوئے ہیں اور یہ کتاب کی صورت میں ہے۔ تعجب ہے کہ اکثر مفسرین نے کتاب مسطور سے نامۂ اعمال یا لوح محفوظ مراد لیا ہے۔ تو کیا لوح محفوظ یا نامۂ اعمال میں چمڑے کا کاغذ استعمال ہوا ہے۔ تاہم غنیمت ہے کہ ابوالسعود اور امام رازی نے کتاب مسطور سے قرآن مراد لیا ہے۔

اس زمانے میں جن چیزوں سے کاغذ کا کام لیا جاتا تھا وہ یہ تھیں۔

۱۔ عسیب (کھجور کی شاخ جس سے پتے الگ کر لیتے تھے) ۲۔ لخف (پتھر کی پتلی تختیاں) ۳۔ رق (نرم کھال کی جھلی) ۴۔ کتف (اونٹ یا بکری کی چوڑی ہڈیاں) ۵۔ قتب (پالان کی لکڑی) مؤرخین کہتے ہیں کہ ان تمام چیزوں میں سے "رق" بڑی محفوظ چیز تھی اور سامان کتابت میں سے ترقی یافتہ کاغذ بھی اسی کو سمجھا جاتا تھا۔ ایک تو اس پر لکھا با سانی جا سکتا تھا۔ دوسرے لکھنے کے لئے ایسی سیاہی استعمال کی جاتی تھی جو نرم کھال پر جم جاتی اور پھر وقت

تمام محو کی جاتی۔ اسی لئے قرآن کا وہ نسخہ جسے کتاب الامام کہا جاتا تھا رق منشور میں لکھا جاتا تھا۔

کاتبینِ وحی کون تھے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتاب الامام کے کاتب کس قسم کے لوگ تھے؟ کیا ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنے طور پر کچھ لکھ لیتے ہوں یا حروف و الفاظ میں کتابت کی غلطی ہو جاتی ہو اس کا احتمال ایک تو یوں بھی غلط ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ایسی محفوظ کتاب قرار دیا ہے جس میں باطل کی آمیزش ناممکن ہے اور اگر بفرضِ محال کتابت کی غلطی ہو بھی جائے تو حضورؐ خود پڑھ کر اسے درست کر لیتے ہوں گے کیونکہ ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ نزولِ قرآن سے بعد حضورؐ پڑھنا لکھنا سیکھ گئے تھے۔ لیکن ہم ان احتمالات میں کیوں پڑیں۔ جس کی کتاب ہے اسی کو جواب دینا چاہیئے کہ کتاب کے کاتب کس قسم کے تھے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۝ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۝ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۝

یقیناً یہ قرآن بہت ہی عظیم الشان ہے جو ایک محفوظ کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ جسے ان لوگوں کے سوا، جنہیں قلب و نظر کی پاکیزگی حاصل ہے۔ کسی اور نے چھوا نہیں۔

چونکہ اسے کتابِ مکنون کہا گیا تھا اس لئے سوال پیدا ہوا کہ آخر اس کے لکھنے والے کون ہیں تو جواب دیا گیا کہ وہ مُطَہَّرین ہیں مطہّر میں طاہر سے زیادہ شدت پائی جاتی ہے۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے قلب و دماغ کو آلائشِ میلانات اور خواہشِ نفسانی چھو بھی نہیں گئی۔ ظاہر ہے کہ کتاب میں دانستہ آمیزش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دماغ میں باطل کا زہر سرایت کر چکا ہو۔ لیکن قرآن کے کاتب وہ لوگ ہیں جنہیں باطل کی نجاست چھو تک نہ سکی۔ دوسری جگہ انہی کاتبینِ وحی کی تعریف میں ارشاد ہے:

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۝ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝ (سورہ عبس)

قرآنِ حکیم نصیحت نامہ ہے جس کا جی چاہے اس سے نصیحت حاصل کرے۔ وہ ایسے صحائف میں لکھا ہوا ہے جو با عظمت، رفیع الشان اور باطل کی آمیزش سے پاک ہیں اور ایسے احساسِ ذمہ داری رکھنے والے کاتبوں کے ہاتھ میں ہے جو بزرگ اور پاکیزہ کردار ہیں۔

سفرۃ کے معانی ہیں کاتب۔ سفارت اور کتابت میں لطیف سا فرق ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کتابت کا لفظ عام لکھنے کے معنوں میں آتا ہے۔ مگر سفارت اس کتابت کو کہتے ہیں جو حسنِ خط، اصولِ املا کی واقفیت، اور قواعد انشاء و لغت کی مہارت کے ساتھ کی جائے۔ گویا یہ حضرات صرف کاتبینِ وحی نہیں بلکہ سفرۃِ وحی تھے۔ ان کے خط بھی دلکش تھے۔

قواعد انشاء و لغت میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے اور اصولِ املاء سے پوری طرح واقف تھے۔ ڈاکٹر ٹرکی صاحب نے صحیح لکھا ہے۔

"ابن الفارس کو یقین ہے کہ صحابہ کرامؓ جو قرآن کی کتابت کرتے تھے معلوم ہوتا کہ وہ ان تمام باتوں سے واقف تھے جن میں علمائے نحو کو واقفیت ہے۔ صحابہ کرامؓ جو لغات وادی دیائی، مہموز، مد، قصر وغیرہ میں فرق کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لغت کے اصول و قواعد میں کافی مہارت رکھتے تھے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم عربیہ اسلام سے قبل ہی ایک حد تک تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔" (النثر الفنی - ج ۱ ص۵۵)

یہاں خوش اعتقاد مفسرین سے بڑی سخت خطا ہوئی ہے۔ انہوں نے سفرۃ کو سفیر کا ہم معنی قرار دیا۔ اور اس سے فرشتے مراد لے لئے۔ اور یہ غلط فہمی اتنی عالمگیر ہوئی کہ امام بخاریؒ بھی سفرہ سے فرشتے ہی مراد لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"یعنی فرشتے جب اللہ کی وحی لے کر آئے تو ان کی حیثیت سفیر کی ہوئی جو دو قوموں کے درمیان صلح کراتا ہے۔" (بحوالہ التراتیب الاداریہ)

سفیر کی مماثلت بھی کیسی غلط ہے۔ وہ تو جاتا ہے دو قوموں کے درمیان صلح کرانے۔ مگر یہاں کون سی جنگ تھی کہ صلح کرانے کے لئے ملائکہ تشریف لائے۔ پھر جن ملائکہ کو سفرائے وحی سمجھا جاتا ہے ان کے ہاتھوں میں لوح محفوظ نہیں کہ "بایدی سفرۃ" کہا جائے۔ نیز وہ لکھے ہوئے اوراق لے کر بھی نازل نہیں ہوتے تھے بلکہ زبانی وحی لاتے تھے پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ "صحف" ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ خدا بھلا کرے امام رازیؒ کا۔ انہوں نے صاف لکھ دیا "سفرہ سے مراد صحابہؓ ہیں" (تفسیر کبیر) کرام کے معنی ہیں بزرگ۔ خدا اور مخلوق کی نظروں میں قابلِ اعتماد، خدا سے ڈرنے والے! "بررہ" کے معنی ہیں نیک، خدا ترس، متقی، احساسِ ذمہ داری رکھنے والے۔ تو آیات کا مفہوم یہ ہوا کہ جو صحابہؓ وحی کی کتابت کرتے ہیں۔ ان کے خط حسن کتابت کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ قواعد انشاء و لغت میں پوری مہارت رکھتے ہیں۔ اصولِ املاء سے پوری طرح واقف ہیں۔ مخلوق اور خالق کی نگاہوں میں قابلِ اعتماد ہیں، نیک اور خدا ترس ہیں اور انہیں اس عظیم ذمہ داری کا بھی پورا پورا احساس ہے جسے وہ سرانجام دے رہے ہیں۔"

اب دیکھئے کہ ایک ایسا کاتب جو مخلوق اور خالق کی نظروں میں قابلِ اعتماد ہو۔ فنِ کتابت کا بھی ماہر ہو۔ خدا ترس

سلہ یہ انہی حضرات کا قول نقل کیا گیا ہے۔ نزولِ وحی کے معاملہ میں میرا نظریہ الگ ہے جو مقدمہ تطبیر القرآن کے باب الوحی میں وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ رستمی۔

اور متقی ہو۔ اسے اپنی عظیم ذمہ داری کا بھی احساس ہو۔ اور خدا و رسول کی نگرانی میں کام کر رہا ہو تو کیا آپ یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس سے دانستہ تو کجا نادانستہ طور پر بھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے، بالخصوص جب اس پر خدا اور رسول کی کڑی نگرانی بھی ہو اور پھر کتابت کی غلطی راہ کیسے پا سکتی ہے جب کتاب کا محافظ خود خدائے قدوس ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ ——— (۱۵/۹)

بے شک ہمیں نے قرآن حکیم کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اللہ اللہ! اس کتاب کے محفوظ ہونے کے کیا کہنے جس کا پاسبان خود اللہ تعالیٰ ہے۔

قرآن لکھا جاتا تھا اور دیکھ کر اس کی تلاوت کی جاتی تھی

قرآن حکیم کفار پر بطور استعجاب یہ سوال وارد کرتا ہے کہ

أَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ——— (۶۸/۴۷)

کیا ان کے پاس بھی علم غیب ہے جسے وہ لکھتے ہوں۔

یعنی قرآن حکیم تو وہ کتاب ہے جو الغیب[1] ہے اور جسے لکھا جاتا ہے تو کیا ان لوگوں کے پاس بھی کوئی الغیب ہے جسے لکھا جاتا ہو۔ دوسری جگہ ہے۔

أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ○ (۶۸/۳۷)

کیا تمہارے پاس بھی کوئی کتاب ہے جسے دیکھ کر پڑھتے ہو؟

یعنی قرآن تو وہ کتاب حق و صداقت ہے جو کتابی شکل میں موجود ہے اور اسے دیکھ کر پڑھا جاتا ہے لیکن کیا تم لوگوں کے پاس بھی کوئی ایسی کتاب ہے؟ اس لئے نبی صلعم نے بشیر اقوال میں لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ مصحف کو دیکھ کر پڑھا کریں حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے۔

"نبی صلعم نے فرمایا کہ اپنی آنکھوں کو بھی عبادت میں سے حصہ دو اور آنکھوں کو عبادت میں شریک کرنا یہ ہے کہ مصحف پر نظر ڈال کر پڑھو۔ غور کرو اور اس کی ہر حکمت عجائبات سے عبرت حاصل کرو۔" (ابن ماجہ۔ شعب الایمان بیہقی۔ کنز العمال)

حضرت عثمانؓ بن عبداللہ سے روایت ہے۔

"حضورؐ نے فرمایا قرآن حکیم کو زبانی پڑھنے سے ایک ہزار درجہ ثواب ہے تو دیکھ کر پڑھنے میں ثواب دگنا ہو جاتا ہے۔" (مشکوٰۃ باب فضائل القرآن)

---

[1] الغیب بہت جامع لفظ ہے لیکن اس کی تشریح کا یہ مقام نہیں، جسے اس کی تشریح مقصود ہو وہ میری کتاب "تفسیر سورہ بقرہ" کو دیکھے (ستّی)

ہر گھر میں قرآن کا نسخہ موجود تھا

آپ نے دیکھا کہ ان روایات میں مصحف کو دیکھ کر پڑھنے کی کتنی حسین ترغیب دی گئی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم کا نسخہ ہر گھر میں موجود ہوتا تھا اور شاید ہی کوئی ایسا گھر رہا ہو جس میں پڑھا لکھا آدمی موجود نہ ہو۔ ابوداؤد جلد دوم کی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عبادہ بن الصامتؓ اصحابِ صفہ کو قرآن پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مستند تاریخی روایت ہے کہ حضور رسلعم نے حضرت عبداللہ بن سعید کو حکم دیا تھا کہ

"مدینے میں جو لوگ لکھنا نہیں جانتے انہیں لکھنا سکھا دیں" (الاستیعاب ج ۱ ص۳۵۸)

جب تمام حضرات لکھ پڑھ گئے تو حضور سرورِ کائناتؐ نے مصحف لکھنے کی ترغیب دی اور میراث میں مصحف چھوڑ جانے کو خیرِ جاریہ قرار دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا کہ بعض اعمالِ حسنہ ایسے ہیں جنہیں خیرِ جاریہ کہنا چاہیئے۔

"وہ اعمال مرنے والے مردِ مومن کو بعد از وفات بھی برابر ثواب پہنچاتے رہتے ہیں پہلی خیرِ جاریہ تو ہے وہ علم جس کی اس نے دوسروں کو تعلیم دی اور اس کی اشاعت کی یا اولادِ صالح جو وہ چھوڑ گیا یا مصحف ہے جو اس نے میراث میں چھوڑا۔ الخ" (مشکوٰۃ کتاب العلم فصل ۲)

چونکہ اس کتاب پر مسلمانوں کا ایمان تھا اس لئے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صحابہؓ کے گھروں میں موجود نہ ہو اور پھر جب حضورؐ دیکھ کر پڑھنے کی ترغیب بھی دے رہے ہوں تو یہ خیال کرنا کہ قرآن صحابہؓ کے گھروں میں موجود نہ تھا قطعاً بے بنیاد خیال ہے۔

قرآن سینوں میں بھی محفوظ کر دیا گیا

قرآنِ حکیم کی کتابت کا جو عظیم الشان اہتمام کیا گیا وہ تو آپ دیکھ چکے ہیں لیکن اس کی اسی حفاظت پر بس نہ کی گئی بلکہ اسے مسلمانوں کے سینوں میں بھی محفوظ کر دیا گیا اور خدا نے اعلان فرما دیا کہ

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۔ (۲۹/۴۹)

بلکہ قرآنِ حکیم واضح آیات کا مجموعہ ہے جو اہلِ علم کے سینوں میں محفوظ ہے۔

اور یہ تو آپ مانتے ہوں گے کہ چاہے مرد ہوں یا عورتیں۔ تمام مسلمان حضورؐ کے عہد میں دینی معاملات میں اہلِ علم تھے۔ گویا قرآنِ حکیم مسلمان مردوں اور عورتوں کو بھی یاد تھا اور ہر گھر میں لکھا ہوا موجود تھا۔

قرآن حضورؐ ہی کے عہد میں جمع ہو چکا تھا

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی کہ

(ا) قرآن نے پہلی وحی میں ہی لکھنے پڑھنے کی اہمیت واضح کر دی تھی۔

(ب) قرآن کی نگاہ میں وہی چیز شکوک و شبہات سے بالاتر ہے جو لکھی گئی ہو۔

(ج) قرآن نے اپنے آپ کو بار بار کتاب کہا ہے اور کتاب اسی چیز کو کہتے ہیں جس کی شیرازہ بندی

کی گئی ہو اور جو لکھ کر محفوظ کی جا چکی ہو۔

(د) قرآن ہر گھر میں لکھا ہوا موجود تھا اور لوگ دیکھ کر اس کی تلاوت کرتے تھے۔

(ہ) قرآن رقِ منشور میں لکھا جاتا تھا۔

(و) قرآن کے لکھنے والے خوشخط، خدا اور بندوں کی نگاہوں میں معتمد، محترم اور اپنی ذمہ داری کا احساس رکھنے والے تھے۔

(ز) قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدائے قدوس ہے۔ اس لئے اس میں آمیزش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ان نتائج کو سامنے رکھئے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی کہ قرآن حضورؐ ہی کے عہد میں لکھ کر محفوظ کر لیا گیا تھا۔ اگر قرآن منتشر ٹکڑوں، کنکروں وغیرہ پر لکھا ہوتا تو اسے کتاب نہیں کہا جا سکتا تھا۔ چنانچہ حاکم لکھتے ہیں۔

"قرآن پہلی بار حضورؐ کے عہد میں جمع کیا گیا تھا" (مستدرک)

اسی طرح حارث محاسبی کہتے ہیں۔

"قرآن کی کتابت کچھ نئی چیز نہ تھی۔ خود آنحضورؐ نے بھی اسے لکھنے کا حکم دیا تھا" (الاتقان)

قرآن کی ترتیب

ان مباحث کو ذہن میں رکھ کر اب اس مسئلہ کی طرف آیئے کہ قرآن کریم کی آیات و سور کو ترتیب کس نے دیا۔ ظاہر ہے کہ جو قرآن کا مصنف ہے وہی اس کا مرتب بھی ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ کچھ لوگ روایات کے چکر میں پڑ کر کہتے ہیں کہ قرآن کو خدا نے مرتب نہیں کیا۔ ہم اس معاملہ میں الجھنا نہیں چاہتے۔ خود خدا کو ہی حکم تسلیم کرتے ہیں۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ جو کچھ اس نے فرمایا ہے وہی حق ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً ۚ كَذَٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهِ فُؤَادَكَ ۖ وَرَتَّلْنَاهُ تَرْتِيلًا ۝ ——— (۲۵/۳۲)

اور کافر کہتے ہیں کہ سارے کا سارا قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا (یہ کیا ہے کہ تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا ہے) یہ اس لئے کہ ہم تیرے دل کو اس کے ساتھ مضبوط رکھیں اور ہم نے اسے حسین ترتیب سے مرتب کیا ہے۔

ترتیل کے معنی ہیں کسی چیز کا حسنِ تناسب کے ساتھ مربوط ہونا۔ حسنِ نظم اور حسنِ ترتیب لئے ہوئے ہونا۔ نزل الکلام کے معنی ہیں کلام کو اچھی طرح ترتیب دینا (تاج العروس محیط المحیط) گویا اس آیت میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ قرآن حکیم کو اس لئے متفرق طور پر نازل کیا گیا ہے کہ حضورؐ کے دل کو تقویت حاصل ہوتی رہے۔ ورنہ اس کا متفرق طور پر نازل ہونا بھی اسے نقصان نہیں پہنچاتا۔

کیونکہ اگرچہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے نازل کیا گیا ہے لیکن اسے ہم نے ایسی احسن ترتیب سے مرتب کیا ہے کہ وہ ایک منظم اور مرتب کلام معلوم ہوتا ہے اور کہیں بھی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔

اس آیت سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قرآن کو خود اللہ تعالیٰ نے ہی مرتب فرمایا ہے۔ سورہ قیامۃ میں ہے

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (۷۵/۱۷)

بے شک قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت سے واضح ہے کہ متفرق آیات کو مرتب کرنا بھی اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ یہ نہیں کہ جہاں مرضی ہو آیت رکھ دی جائے خیال رہے کہ متفرق آیات کو جمع کیا گیا تو ترتیب قائم رکھ کر ہی جمع کیا گیا۔ جو چیز غیر مرتب ہو اس پر جمع کے لفظ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ علماء نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے۔

"آیتوں کی ترتیب اپنی اپنی سورتوں میں رسول اللہ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کی ہے۔ اس پر اجماع ہے اور مسلمانوں کو اس میں کوئی اختلاف نہیں"۔ (البرہان مصنفہ زرکشی۔ المناسبات مصنفہ ابوجعفر بن الزبیر)۔

قاضی ابوبکر فرماتے ہیں۔

"قرآن کا نظم اور اس کی ترتیب اسی انداز پر ہے جس طرح اللہ نے اسے مرتب فرمایا ہے۔ حضورؐ نے اصل ترتیب کو نہیں بدلا۔ نہ کسی پیچھے کی آیت کو آگے کیا نہ آگے کی آیت کو پیچھے"۔ (کتاب الانتصار)

علامہ ابن الحصار کا قول ہے۔

"آیات و سور کی ترتیب اللہ کے حکم سے ہوئی"۔ (الاتقان ج ۱)

علامہ طیبی کہتے ہیں۔

"قرآن مصاحف میں اسی نظم و ترتیب سے جمع ہوا ہے جیسا کہ لوح محفوظ میں ثبت ہے"۔ (ایضاً)

سورتوں کے نام مقدار اور ترتیب

اکثر مؤرخین کہتے ہیں کہ قرآن کی سورتوں کی مقدار بھی حضورؐ کے بعد معین ہوئی اور ان کے نام بھی بعد میں رکھے گئے۔ لیکن آپ مندرجہ ذیل آیات پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ خود سورت کا لفظ بھی قرآن ہے اس لئے اس کی مقدار بھی خدا کی معین کردہ ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ ۔ (۱۰/۳۸)

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ (محمدؐ نے) قرآن اپنی طرف سے گھڑ لیا ہے انہیں کہئے کہ اس جیسی کوئی سورت تو بنا لاؤ۔

دوسرے مقام پر یہی چیلنج ان الفاظ میں پیش کیا گیا۔

قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ ۔ (۱۱/۱۳)

ان سے کہئے ذرا تم بھی اس جیسی دس سورتیں گھڑ لاؤ۔

ان ارشادات سے واضح ہے کہ سورتوں کی مقدار اللہ تعالےٰ نے خود معین کی اور ساتھ ہی ان کے نام بھی کیونکہ روایات میں ہے کہ۔

"جب کوئی آیت نازل ہوتی تو حضورؐ فرماتے اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ لکھو۔ (بحوالہ الاتقان)

فلاں سورت کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ نام پہلے سے متعین تھے۔ نیز سورتوں کی ترتیب بھی اللہ کے حکم سے ہوئی کیونکہ اگر آپ سورتوں کو فصول اور ابواب سمجھیں تو جب تک فصول و ابواب کو ترتیب نہ دی جائے یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کتاب خدا کی مرتب کردہ ہے۔ کتاب کی ترتیب، ابواب و فصول ہی کی ترتیب کا نام ہے۔ ابن الانباری کہتے ہیں۔

"سورتوں کا التساق اور ان کی ترتیب بھی آیات و حروف کے التساق و ترتیب کی طرح خدا کے حکم سے ہوئی۔ (الاتقان)

امام بغوی لکھتے ہیں۔

"صحابہؓ نے جس طرح رسول اکرم صلعم سے قرآن سنا بلا تقدیم و تاخیر اسے لکھ لیا یہاں تک کہ اس کی ترتیب میں بھی حضورؐ کی ترتیب کو نہ چھوڑا" (شرح السنۃ)

علامہ کرمانی کہتے ہیں:۔

"سورتوں کی یہ ترتیب اسی طرح اللہ کے نزدیک لوح محفوظ میں تھی" (کتاب البرہان)

علامہ زرکشیؒ نے امام مالکؒ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ:۔

"صحابہؓ نے قرآن کی ترتیب اپنے اجتہاد سے نہیں کی بلکہ حضورؐ کی ترتیب کی پیروی کی" (البرہان)

امام بخاریؒ ابن مسعودؓ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے۔

"بنی اسرائیل، کہف، مریم، طٰہٰ، انبیاء کی سورتیں عتاق الاول میں سے ہیں۔ اور یہ ایسی سورتیں ہیں جن کو میں نے بہت پہلے اخذ کیا"

یہ روایت لکھ کر علامہ سیوطیؒ کہتے ہیں۔

"چونکہ ابن مسعودؓ نے اسی ترتیب سے سورتوں کے نام لئے ہیں جس طرح آج مصحف میں موجود ہیں۔ اس لئے معلوم ہو جاتا ہے کہ سورتوں کی ترتیب حضورؐ کے زمانے میں یہی تھی۔ (الاتقان ج ۱)

علامہ ابن حجرؒ کہتے ہیں:۔

سورتوں کی ترتیب کے توقیفی (مطابق حکم خداوندی) ہونے پر وہ حدیث بھی دلالت کرتی ہے جسے

احمد، ابو داؤد نے اوس کے واسطہ سے روایت کیا ہے کہ حذیفہ الثقفی نے کہا، رسول اللہؐ نے ہم سے فرمایا۔ "قرآن کی ایک منزل پڑھنا میرا معمول بن گیا تھا۔ جب یہ روایت بیان کی گئی تو ہم لوگوں نے اصحابؓ سے دریافت کیا۔ "تم قرآن کی منزل کس طرح مقرر کرتے ہو۔ صحابہؓ نے جواب دیا۔ ہم قرآن کی منزلیں تین، پانچ، سات، نو، گیارہ اور تیرہ سورتوں کی کرتے ہیں اور آخری منزل مفصل سورہ ق سے کرتے ہیں یہاں تک کہ قرآن ختم ہو جاتا ہے" میرے (ابن حجر کے) نزدیک یہ حدیث صاف بتا رہی ہے کہ آج جس انداز پر مصحف میں سورتوں کی ترتیب پائی جاتی ہے یہی ترتیب رسولؐ خدا کے عہد مبارک میں تھی۔"　　(الاتقان ج ۱)

ابو جعفر النحاس کہتے ہیں:-

"قولِ مختار یہ ہے کہ رسول خدا صلعم کے عہد میں قرآن اسی ترتیب پر مرتب ہو چکا تھا۔ اسی پر واثلہ کی حدیث (مجھے توراۃ کی جگہ سبع طوال یعنی سات لمبی سورتیں دی گئی ہیں) بھی دلالت کرتی ہے کہ قرآن کی ترتیب رسولؐ خدا صلعم سے ماخوذ ہے"　　(ایضاً)

اور ان عوام الناس کا یہ قول بھی غلط ہے کہ سورتوں کے نام بعد میں رکھے گئے کیونکہ اکثر روایات میں یہی نام حضورؐ نے لئے ہیں ہم ان تفاصیل میں نہیں جانا چاہتے، کیونکہ علم حدیث سے جسے بھی مس ہے وہ اس بات سے اچھی طرح واقف ہے۔

بعض دیگر روایات کو بھی ہم نظر انداز کر رہے ہیں جن میں ذکر ہے کہ حضورؐ نے فلاں نماز میں فلاں سورت پڑھی اور فلاں موقع پر فلاں سورت پڑھی۔ اس سلسلہ میں ہم سیوطی کا ایک قول نقل کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔

"آنحضرت صلعم کا صحابہؓ کے سامنے سورت پڑھنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ سورتوں کی آیات مرتب تھیں۔ نیز ان کے نام بھی عہد نبویؐ میں مشہور تھے۔　　(الاتقان ج ۱)

قرآن کی قرأت

عوام الناس کا خیال ہے کہ قرآن کی قرأتیں مختلف تھیں۔ پھر انہیں حضرت عثمانؓ نے جمع کر دیا۔ ہم اسے غلط سمجھتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ ۝ فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ ۝ (۷۵/۱۷-۱۸)

قرآن کا پڑھنا اور اس کا جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے پس جب ہم اس کو پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر۔

اس آیت سے واضح ہے کہ اللہ نے حضورؐ کو قرآن پڑھا بھی دیا تھا اور پھر حکم دیا تھا کہ وہ اسی قرأت کی پیروی کریں۔ جو اللہ نے آپ کو پڑھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ قرأت ایک ہی تھی۔ اور اسی کا اتباع صحابہ کرامؓ نے بھی کیا۔ پس یہ بالکل لغو روایت ہے کہ قرآن کی اتنی قرأتیں ہیں۔ اس مسئلہ پر ہم اگلے باب میں بالتفصیل بحث کریں گے۔

قرآن مکمل کتاب ہے

اس عنوان پر باقی مباحث میں بالتفصیل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف چند آیات نقل کی جاتی ہیں۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۴)

تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں حالانکہ وہ وہی ذاتِ بلند و برتر ہے جس نے تمہاری طرف مفصل کتاب اتاری۔

یعنی قرآن حکیم ایسی مفصل و مکمل کتاب ہے کہ اس میں تمام احکام موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کتاب کو قولِ فیصل نہیں کہا جا سکتا۔

اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ — قرآن قولِ فیصل ہے کوئی ہزل نہیں

ایک اور جگہ فرمایا گیا۔ تَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَيْءٍ یعنی اس کتاب میں دین کے تمام اصول بالتفصیل موجود ہیں۔ ایک اور جگہ ہے

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ——— (۱۶/۸۹)

اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے۔

قرآن اپنی تشریح خود کرتا ہے

"تبیاناً لکل شئ" میں یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ دین کے تمام اصول قرآن نے کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں اس کے لئے ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ہم خود قرآن کی تشریح کرتے ہیں۔

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ وَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝

قرآن کا پڑھنا اور اس کا جمع کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ پس جب ہم اس کو پڑھیں تو تو اس کے پڑھنے کی پیروی کر۔ پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا گیا ہے۔

(ا) قرآن کی جمع و تدوین خدا کے ذمہ ہے۔

(ب) قرآن کی قرأت خدا کے ذمہ ہے۔ اور حضورؐ ایسی قرأت کی اتباع کرتے تھے۔

(ج) قرآن کی تشریح بھی خدا کے ذمہ ہے اور قرآن کی آیات ایک دوسرے کی تفسیر کرتی ہیں۔ اسے تفسیر القرآن بالقرآن کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں مفتی محمد عبدہٗ فرماتے ہیں۔

"سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ الفاظ کے معانی کے تعین میں خود قرآن سے مدد لی جائے اور مکرر آنے والے الفاظ کے مطلب کے تعین میں قرآن کے دیگر مقامات کا مطالعہ کیا جائے۔ بعض اوقات آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی لفظ متعدد معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ہدایت وغیرہ۔ ان مقامات پر غور و فکر سے معلوم ہو جائے گا کہ فلاں مقام پر اس لفظ کے صحیح معانی کیا ہیں۔ اسی لئے کہا گیا کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً (قرآن کا ایک مقام دوسرے مقام کی تفسیر کرتا ہے)" (مقدمہ تفسیر المنار)

اس بات کو قرآن "تصریف آیات" سے تعبیر کرتا ہے۔ ارشاد باری ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۶/۱۰۵)

اس طرح ہم قرآن کی آیات کو بار بار پھیر کر لاتے ہیں تاکہ یہ لوگ کہیں تو نے بات ذہن نشین کرادی۔ اور اس طرح ہم ان لوگوں کے لئے بات واضح کردیں جو علم رکھتے ہیں۔

قرآن عربی مبین میں نازل ہوا

چونکہ قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب تھے اس لئے قرآن حکیم عربی میں نازل ہوا اور اس کا انداز بیان مغلق اور پیچیدہ نہیں بلکہ واضح اور آسان ہے۔

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ ——— (۲۶/۱۹۲)

یہ قرآن رب نے اتارا ہے، روح الامین اسے لے کر تیرے قلب پر نازل ہوا تاکہ تو انبیاء میں سے ہو۔ یہ قرآن واضح عربی میں نازل ہوا۔

چونکہ قرآن کے مخاطب جاہل اور عالم دونوں قسم کے لوگ تھے اس لئے اس نے کوئی ایسا لفظ استعمال نہ کیا جو اس کے مخاطبین کی سمجھ سے بالا ہو۔

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۔ (۱۲/۲)

ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا تاکہ تم سمجھ سکو۔

ایک اور جگہ ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ ——— (۴۱/۳)

یہ ایسی کتاب ہے جس کی آیات مفصل ہیں اس طرح یہ قرآن عربی اہل علم کے لئے واضح ہوگیا۔

سورۂ قمر میں اس حقیقت کو بار بار دہرایا گیا ہے کہ

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۔ (۵۴/۱۷)

یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان بنا دیا ہے تو کیا ہے کوئی نصیحت حاصل کرنیوالا۔

ان آیات کو مدنظر رکھ کر غور کیجئے کہ قرآن اس قدر آسانی کا دعویٰ کرتا ہے تو کیا یہ تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ جو دعوت حق و صداقت کے مبلغ اور عربی کے ماہر تھے، قرآن کے مفہوم سے ناواقف ہوں گے۔ نعوذ باللہ۔ مگر ہماری کتب روایات میں کہا گیا ہے کہ بعض الفاظ صحابہؓ کی سمجھ میں نہیں آئے۔ اس موضوع پر ہم اگلے باب میں بحث کریں گے۔

قرآن محفوظ ہے

ہم نے دلائل کے ساتھ یہ بات ثابت کر دی ہے کہ قرآن حکیم وہ کتاب ہے جو انسانی دستبرد سے اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دی ہے۔ اللہ نے اس کی حفاظت کا اعلان فرمایا ہے۔ غور کیجئے کہ خدائے علیم و خبیر نے جس کتاب کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا اس میں ذرا سی غلطی کا امکان بھی ہو سکتا ہے؟ ہمارا

ایمان ہے کہ قرآن حکیم حضورؐ ہی کے زمانے میں لکھا جا چکا تھا۔ اور کتاب الامام سے متعدد صحابہؓ نے اس کی نقلیں اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں۔ صحابہؓ کے سینوں میں بھی یہ من وعن محفوظ ہو گیا۔ نہ کسی لفظ کی بجائے مترادفات استعمال کئے گئے نہ کسی نے اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی اور آپ دیکھ چکے ہیں کہ ہمارا یہ ایمان کورانہ تقلید کا ثمر نہیں بلکہ عین وجہ البصیرت ہے۔ اور اس معاملہ میں ہم منفرد نہیں بلکہ دوسرے محققین بھی ہمارے ساتھ ہیں۔

قرآن محفوظ ہے محققین کا اعلان

علامہ قاضی ابوبکر فرماتے ہیں۔

"ہمارا ایمان ہے کہ وہ تمام قرآن جسے اللہ نے نازل فرمایا اُسے لکھ لینے کا حکم دیا۔ اس کو منسوخ نہیں کیا۔ اور نہ اس کے نزول کے بعد اس کی تلاوت کو رفع کیا وہ یہی قرآن ہے جو بین الدفتین پایا جاتا ہے۔ اس قرآن میں نہ کوئی کمی ہے نہ بیشی۔ اس کا نظم اور اس کی ترتیب اسی انداز پر ہے جس طرح اللہ نے اسے مرتب کیا۔" (کتاب الانتصار)

علامہ سالم بن موسیٰ لکھتے ہیں۔

"ہمارا ایمان ہے کہ یہی قرآن جو مابین الدفتین محفوظ ہے اسی طرح لکھا ہوا حضورؐ نے امت کے حوالہ کیا اس کا محافظ خدا ہے۔ اور اس میں آج تک ایک لفظ اور ایک شوشہ تک کی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ ہمارا ایمان مبنی بر حقائق ہے۔ کیونکہ معاندین اسلام باوجود کوشش بسیار آج تک یہ ثابت نہیں کر سکے کہ قرآن کے قدیم اور جدید نسخوں میں کوئی فرق ہے۔ بلکہ انہیں اعتراف کرنا پڑا ہے کہ یہ عین وہی قرآن ہے جو حضورؐ کے زمانہ میں موجود تھا۔ چنانچہ متعصب مستشرق پادری ڈوزی۔ ایم کا بیان ہے "یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ قرآن محمدؐ کے زمانے میں مرتب و مدون ہو چکا تھا جو آج تک بغیر کسی تغیر کے محفوظ ہے۔ اس کی عبارات میں کوئی اختلاف نہیں۔ مگر یہ جو مختلف مذاہب اسلام میں پیدا ہو گئے۔ یہ قرآن کا مختلف مفہوم کیوں بیان کرتے ہیں" (MOHAMMAD AND HIS RELIGION P. 108) - مردست ہمیں اس سے بحث نہیں کہ مختلف فرقے اسلام میں کیوں کر راہ پا گئے۔ ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ دشمنوں کو بھی قرآن کے محفوظ ہونے کا اقرار ہے" (کتاب مکنون ص۸)

علامہ رافع اصبہانی فرماتے ہیں۔

"لندن ٹائمز کے ۲۵ اپریل کے شمارے نے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قرآن بھی انجیل کی طرح محرف ہو چکا ہے۔ ہم لندن ٹائمز کو ہی نہیں پوری دنیا کو چیلنج کرتے ہیں کہ قرآن کا کوئی ایسا نسخہ دکھا دیں

شہ اس موضوع پر میری کتاب "عقوبۃ الافتراق" دیکھئے (سیفی) اس کے ایک باب کا ترجمہ طلوع اسلام میں شائع ہو چکا ہے۔ طلوع اسلام۔)

جو مروجہ نسخہ سے مختلف ہو۔ رہا وہ نسخہ جس کا ذکر اخبار مذکور میں ہے تو اس کے متعلق خود ٹائمز میں ہے کہ ان بوسیدہ اوراق پر تین تحریریں ہیں۔ پرانی کتابوں کی یہی حالت تھی۔ کاغذ کی کمی کی وجہ سے جب پرانی تحریر دھندلی پڑ جاتی تو اس پر کوئی اور کتاب لکھ دی جاتی تھی۔ ٹائمز کا بیان ہے کہ اس کتاب پر پہلی دو تحریریں سریانی میں ہیں جو پروتی وینجیلیم اور ٹرنی زینیئس میبری کی ہیں۔ تیسری اور آخری تحریر قرآن حکیم کی ہے۔ ڈاکٹر منگانا نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اوراق مذکورہ تین سے زائد ماخذوں سے حاصل کئے گئے ہیں جن میں سے بعض ماخذ اس وقت سے پہلے کے ہیں جب حضرت زید بن ثابت نے قرآن کو قرآن کو ترتیب دیا تھا۔ ڈاکٹر منگانا نے بتایا ہے کہ تقریباً ہر صفحے میں موجودہ نسخہ سے کوئی نہ کوئی اختلاف موجود ہے۔ ایک مثال یہ ہے کہ 'بَارَكْنَا حَوْلَهُ' کی بجائے اس نئے دستیاب شدہ نسخہ میں کچھ ایسے الفاظ موجود ہیں جن کا مفہوم ہے "جب ہم حرم کے گرد جھکے" ہم ڈاکٹر صاحب کی غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے بہت کچھ لکھتے لیکن ابھی یہ اوراق زیر اشاعت ہیں اس لئے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اور مثال بھی صرف ایک دی گئی ہے۔ لیکن ہم اس کا تجزیہ بھی کرنا چاہتے ہیں۔ بارکنا حولہ کو بعض کتابوں میں برکنا حولہ بھی لکھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے ہم نے اس کے ماحول کو برکت دی لیکن اگر ب پر مد ہو اور لمبے بوکنا حولہ پڑھا جائے تو بوکنا کا مفہوم ہے "ہم اس کے گرد جھکے" غالباً عربی سے ناواقفیت کی بنا پر ڈاکٹر صاحب کو دھوکا ہوا ہے۔" (الاعتصام (مصر) ج، سنہ ۴۲ء)

اس کے دو سال بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں۔

"ہم نے آج سے بہت عرصہ پہلے لکھا تھا کہ ڈاکٹر منگانا کا دعویٰ خلاف واقعہ ہے چنانچہ آج ہمارے اس دعویٰ کی تائید خود یورپ سے ہوئی اور کہا گیا ہے کہ جس نسخہ کے متعلق خیال تھا کہ وہ موجودہ نسخہ سے مختلف ہے وہ دراصل مختلف نہیں۔ ایک تو عبارتیں بہت الجھی ہوئی ہیں دوسرے نسخہ بوسیدہ ہے اس لئے کہیں کہیں سے پڑھا نہیں جا سکتا۔" (الفرقان ص ۳۳)

اسی کتاب میں مختلف مثالیں دے کر فرماتے ہیں۔

"مس بیرونیس مارگریٹ۔ وان اسٹین کا یہ بیان قرآن کے محفوظ ہونے کا کتنا بڑا اعتراف ہے "اگرچہ تمام مذہبی صحائف منزل من اللہ ہیں۔ لیکن صرف قرآن ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جو تغیر سے محفوظ ہے اور آج بھی اپنی اصل شکل میں موجود ہے۔" فرانسیسی مستشرق ریبی ہین نے بھی اسی طرح کا اعتراف کیا ہے فرماتے ہیں "قرآن آج بھی اسی شکل میں محفوظ ہے جس شکل میں محمد صلعم نے لکھوا کر امت کے حوالہ کیا تھا (ایضاً)

مسٹر ہارٹ وگ ہرشفیلڈ فرماتے ہیں:۔

دورِ حاضرہ کے نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن حکیم کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخے کا ہو بہو عکس ہیں جو زید بن ثابت نے لکھا تھا۔ قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے جو محمد صلعم نے امت کے حوالہ کیا تھا۔"

(NEW RESEACHES INTO THE COMPOSITION & EXEQESES OF THE QURAN)

سر ولیم میور لکھتے ہیں۔

" اس بات کے لئے داخلی و خارجی دونوں قسم کی ضمانت موجود ہے کہ آج کل قرآن کا جو نسخہ مروج ہے اس کا متن بعینہٖ وہی ہے جو خود محمد صلعم نے امت کو دیا تھا اور خود استعمال کیا تھا۔"

(LIFE OF MOHAMMAD)

انسائیکلوپیڈیا میں قرآن کا مخالف لکھا اعتراف کرتا ہے۔

" یورپ کی محققین کی وہ تمام کوششیں بے بنیاد اور ناکام ثابت ہوئیں جو انہوں نے قرآن میں حک و اضافہ ثابت کرنے کے لئے کی تھیں۔"

(ENCYCLOPEDIA BRITANICA)

ہم نے زیادہ تر یورپی محققین کے اقوال نقل کر دیئے ہیں۔ مسلمان محققین میں سے صرف علامہ قاضی ابوبکر کا قول دیا گیا ہے باقی جگہ ہم نے مسلمان محققین کی عبارات میں سے بھی صرف وہ حصے لکھے ہیں جہاں کسی غیر مسلم کا بیان آیا ہے۔ کیونکہ اصل شہادت دشمن کی شہادت ہے۔

قرآن کے قدیم نسخے غیر مسلم محققین نے یہ بھی تحقیق کی ہے کہ قرآن کے قدیم نسخے کہاں کہاں رہے اور اس وقت کہاں ہیں۔ چنانچہ وہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے دمشق میں جو نسخہ بھجوایا تھا وہ سلطان عبدالحمید کے زمانے تک جامع دمشق میں موجود تھا۔ لیکن جب وہ مسجد جل گئی تو یہ مصحف بھی جل گیا۔ مدینہ اور مکہ میں آٹھویں صدی تک ان قدیم نسخوں کا موجود ہونا ثابت ہے۔ بصرہ کا نسخہ مختلف مقامات پر پھرتا پھراتا ۱۹۲۳ء میں ماسکو پہنچا۔ یہ نسخہ ابوبکر الشاشی نے تیمور کے عہد میں شیخ عبداللہ کے مرقد پر رکھا۔ جہاں سے وہ بالشویکوں کے ہاتھوں میں آیا۔ سلطان سلیم اول کے حوالے جو تبرکات کئے گئے تھے۔ جب خلافتِ عثمانیہ کی بنیاد پڑ رہی تھی تو ان تبرکات میں حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا مصحف بھی تھا۔ اسی طرح ان تبرکات میں حضرت علیؓ اور حضرت زین العابدینؒ کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے مصاحف بھی تھے۔ یہ مصاحف اب تک وہاں موجود ہیں۔ مشہد میں بھی حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا ایک نسخہ موجود ہے جس پر ان کے دستخط بھی ہیں ایران کے عجائب خانہ میں حضرت ثابتؓ۔ حضرت علیؓ۔ حضرت عثمانؓ۔ حضرت حسنؓ اور حضرت سجادؒ کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے مصاحف موجود ہیں۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ان حقائق و شواہد کی بنا پر (جو سابقہ صفحات میں آپ کی نظر سے گزر چکے ہیں) ہمارا ایمان ہے کہ قرآن حکیم حضور صلعم نے کتابی صورت میں امت کے حوالہ کیا تھا۔ اس کی مرتب، جامع اور محافظ خود خدائے بلند و برتر کی ذات اقدس

اعظم ہے۔ اس کتاب مطہر میں ایک لفظ ایک حرف بلکہ نقطہ اور زبر زیر تک کا تغیر نہیں ہوا۔ یہ کتاب کل بھی محفوظ تھی آج بھی محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ کیونکہ اس کا محافظ خود خدائے قدوس ہے۔

ہم نے جن عنوانات کے تحت بحث کی ہے انہیں اپنے ذہن میں رکھئے کیونکہ اگلے باب میں ہم روایات کا قرآن کے ماتحت وہ تمام روایات جمع کردیں گے جن میں ان تمام مضامین کی تردید ہوگی جو ہم نے قرآن سے ثابت کئے ہیں۔ اس وقت آپ دیکھیں گے کہ معاندین اسلام کو ہماری روایات کس قدر زہریلا مواد فراہم کر رہی ہیں اور یہ لوگ جو قرآن کو بھی مانتے ہیں اور روایات کو بھی ان کے عقائد کس قدر عجیب و غریب ہیں۔ آپ ان کی معتبر کتب روایات کو پڑھ کر اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ قرآن (معاذ اللہ) لسانی دستبرد سے محفوظ نہیں رہا۔ اس میں لفظی اختلافات راہ پا گئے ہیں اس میں مفہوم کو بدل دینے والے قرأت کے اختلافات موجود ہیں۔ مختلف مصاحف میں فرق ہے۔ حضرت عثمانؓ کے لکھے ہوئے صحیفہ میں حجاج بن یوسف نے تغیرات کئے۔ صحابہؓ قرآن کے بعض الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔ یہ اور اس قسم کی کئی عجیب و غریب روایات کا ہم استقصا کریں گے۔ اور پھر ان روایات پر قرآن، درایت اور انہی حضرات کے فن اسماء الرجال کی رُو سے تنقید کر کے ثابت کردیں گے کہ قرآن کے خلاف عجمیوں کا محاذ اپنی اس ناپاک سازش میں ناکام رہا۔ اور اللہ کی کتاب ہدایت آج تک محفوظ ہے۔ اور وہ لوگ بھی موجود ہیں جو نشان دہی کر سکتے ہیں کہ کس مقدس قبا کی آستینوں میں شیطان لعین کے ہاتھ چھپے ہیں۔ دکھاوے کے کس جبہ یا فرغل میں ابلیس اپنی باہیں ہلا رہا ہے۔ اور کن کن مقدس عماموں کے نیچے خناس کا سر چھپا ہے (تاکہ یوسوس فی صدور الناس (لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرے) اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض لوگ اپنی علمی دیانت کے لحاظ سے پوری طرح واجب الاحترام بھی ہیں جنہوں نے غلط فہمی کا شکار ہو کر ایسی روایات کو اپنی کتابوں میں جگہ دی۔ سو ہمارے یہ فقرات ان پر چسپاں کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

غرضیکہ اگلے باب میں آپ دیکھیں گے کہ ہم نے قرآن کے دلائل و شواہد کی بنا پر جو ایمان قائم کیا بعض روایات کس قدر معصوم طریقے سے اس میں رخنے پیدا کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔

اللہ کرے ہماری ان گزارشات کو پڑھ کر ہمارے وہ بھائی صراط مستقیم پر آجائیں جو کتاب مکنون کے متعلق یہ گمان رکھتے ہیں کہ اس میں تغیر و تبدل ہو گیا۔ اس کی بعض آیات اس میں موجود نہیں رہیں۔ اس میں قرأت کے اختلافات ہیں۔ اور نعوذ باللہ صحابہؓ کتاب مبین کے الفاظ کا مفہوم نہیں سمجھتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ○

قرآن کو سمجھ کر پڑھو اور پھر اس پر عمل کرو ——

ط۔ طلوع اسلام بابت نومبر ۱۹۵۲ء میں اس موضوع پر بھی تفصیل سے لکھا جا چکا ہے

تعاون

(محترم عبدالرب صاحب)

مل جل کر رہنا اجتماعی زندگی کا لازمہ ہے۔ انفرادی زندگی کے دور میں انسان کا گزارہ پھلوں اور اپنے مارے ہوئے شکار پر تھا۔ جانوروں کی کھال اور درختوں کے پتے اس کے جسم کو گرمی سردی سے بچاتے تھے۔ گھر در تو تھا نہیں کسی غار دار میں سو رہتا ہوگا۔ اجتماعی زندگی شروع ہوئی تو اس نے کام بانٹ لئے۔ کسی نے خوراک پیدا کی کسی نے کپڑا بنا۔ کسی نے گھر بنائے۔ کسان، جولاہا، راج، بڑھئی وغیرہ اپنا اپنا کام کرتے تھے مگر دھیان سب کا یہی تھا کہ جو چیز نیاز ہو وہ استعمال کرنے والی ضرورت کو اچھی طرح پوری کرے۔ رفتہ رفتہ یہ دھیان جاتا رہا اور کام کرنے والے کے سر میں یہ خناس سمایا کہ چونکہ میری خدمت حاصل کرنے پر دوسرے مجبور ہیں اس لئے من مانی اُجرت مانگو اور کام بھی اونا پونا کرو تاکہ کمائی زیادہ سے زیادہ ہو۔ تجربہ تو خوب کامیاب ہوا۔ مگر تعاون کا جذبہ دلوں سے نکل گیا۔ اور اس کی جگہ لوٹ کی ہوس نے لے کر معاشرہ کو جہنم بنا دیا۔

اللہ کی اس وسیع و عریض زمین پر انسانی آبادی خدا جانے کب سے اٹھتی بیٹھتی لہروں کی شکل میں وقت کی مسافت آہستہ آہستہ کچھ اس طرح طے کر رہی ہے جیسے آگ اگلنے والے پہاڑوں کی چوٹیوں سے نکلا ہوا انگارہ لاوا کیچوے کی چال ڈھلان کی طرف بہتا ہے۔ نسلیں پیدا ہوتی ہیں ابھرتی ہیں۔ ڈھلتی ہیں اور ختم ہوتے ہوئے ہر نسل زندگی کی دوڑ اگلی نسل کو تھما جاتی ہے۔ کوئی سو سال میں تین نسلوں کے حساب سے۔ ان لہروں کا اٹھنا اور گم ہو جانا خاموشی سے نہیں بلکہ فساد کے ہنگاموں اور آگ اور خون کے کھیل کے ساتھ برابر ہو رہا ہے جس کا مختصر سا نمونہ تقسیم کار کے بہانہ سے انسان کا انسان کو دن دہاڑے لوٹنا اور زندگی کو عذاب بنانا ہے۔ چودہ سو برس ہوئے آئے کہ انسان سے انسان کی دشمنی کا المیہ نمایاں طور پر سامنے آیا۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کو لوٹ کھسوٹ کی لعنت سے پاک کیا۔ اللہ کے رسول نے دن رات کی مسلسل کوشش سے اصلاحی ضمیر تیار کیا اور اس ضمیر نے دنیا کی انسانی آبادی کو اس مقام پر لا کھڑا کیا۔ جہاں اس کی زندگی میں امن چین کا دور دورہ ہوا اور جہاں انسانی

ذات نشوونما پاکر بقائے دوام کے قابل ہو جائے۔ تربیت عقل کے منہ میں لگام دی اور نوع انسان کے کل مفاد سے معاشرہ کو روشناس کیا۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔

بدلے ہوئے معاشرہ میں ہر کام کرنے والا پوری محنت اور دیانت داری سے کام کرنے لگا۔ اپنی اجرت کا خیال کم اور دوسرے کے فائدہ کا دھیان زیادہ۔ لوٹ کھسوٹ ہونے کی بجائے کام خدمت بن گیا۔ رزق کے خزانے جو اللہ تعالیٰ نے زمین میں رکھ دئے ہیں ان میں سے اپنا حق خالصتاً محنت سے حاصل کیا جانے لگا اور دوسرے کے حق میں دست درازی کا تصور مٹ گیا۔ بدلے ہوئے معاشرہ کے ماتھے پر لکھا ہوا تھا۔ "رحماء بینھم" آپس میں ایک دوسرے کی نشوونما کرنے والے۔ اب معاشرہ کا ہر فرد دوسرے سے کہتا "السلام علیکم" تم پر سلامتی ہو۔ تمہاری ذات کو سالمیت نصیب ہو۔ بدلا ہوا معاشرہ تھا اسلامی معاشرہ۔ سچے مسلمانوں کا معاشرہ۔

جنہوں نے اللہ سے اطاعت کا عہد باندھا اور اس عہد کو زندگی بھر پورا کیا۔ پھر آئے وہ مسلمان جنہوں نے اللہ کی اطاعت کا عہد دل کو خبر ہوئے بغیر کیا یا دل و دماغ کے مشورہ بغیر یونہی زبان سے دہرا دیا۔ یہ تھے اسلامی قوت کے مطیع یا پیدائشی مسلمان۔ مسلمان باپ کے مسلمان بیٹے۔ انہیں عہد کا خیال رہا نہ پاس۔ پھر وہی پرانی لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔ "تعاونوا علی البر والتقویٰ ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" کی ہدایت نہ کبھی سمجھنے کی کوشش کی۔ نہ اس پر کاربند ہوئے اور عدم تعاون کی سزا بھگت رہے ہیں۔

تعاون زندگی کے لنگر کی اسی طرح ایک شاخ ہے جیسے ایماندارانہ محنت اور ہر انسان کی عزت۔ تعاون کیا ہے؟ ایک دوسرے کی نشوونما کا دھیان رکھنا۔ زبان ہاتھ پیر یا روپیہ پیسے سے دوسروں کی نشوونما میں مدد دینا اور کسی کی پگڈنڈی میں رکاوٹ ہرگز نہ بننا۔ تعاون کے بغیر انسانی ذات کی نشوونما ممکن نہیں۔

مفت

مجرب دوا برائے:- دمہ۔ درد گردہ و پتھری۔

ملنے کا پتہ:-

حاجی محمد دین۔ شیخ آئس فیکٹری۔ متصل گنپتی کھوپرا ملز لارنس روڈ۔ کراچی

نوٹ:- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

رابطۂ باہمی

(بزم ہائے طلوعِ اسلام کی ماہانہ رپورٹیں)

کراچی ۔ بزم طلوعِ اسلام کراچی کے اس ماہ تین اجلاس منعقد ہوئے۔ پہلے اجلاس میں پچھلے ماہ کی کارگزاریوں کا جائزہ لیا گیا اور آیندہ ماہ کے لئے پروگرام مرتب کیا گیا۔ اسی اجتماع میں اراکین بزم سے نئے رکنیت فارم پُر کرائے گئے اور آیندہ سال کے لئے جناب شیخ محمد شفیع صاحب کو بالاتفاق بزم کا نمایندہ منتخب کیا گیا۔ نیا ٹیپ ریکارڈ خرید لینے اور ٹیپ نشر کرنے کے پروگرام کو از سرِ نو ترتیب دینے کی وجہ سے سامعین پر اچھا اثر پڑا۔ اور گزشتہ دو ہفتوں میں درسِ قرآن سننے والوں کی تعداد کافی بڑھ گئی ہے اور امید ہے کہ سامعین کی اس تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ اسکولوں اور کالجوں میں طلوعِ اسلام کا لٹریچر باقاعدگی سے تقسیم کیا جا رہا ہے۔

جشنِ نزولِ قرآن کی تقریب پر احباب کا دوسرا اجتماع ۲ مارچ کو محترم شیخ محمد انور صاحب کے دولتکدہ پر منعقد ہوا۔ یہ اجتماع بڑا ہی اثر انگیز اور نتیجہ خیز تھا۔ اراکین بزم کے علاوہ درسِ قرآن کے ہفت روزہ اجتماع میں شریک ہونے والے حضرات نے بھی اس تقریبِ سعید میں شمولیت فرمائی۔ ان کے علاوہ تقریباً ۵۰ نئے احباب بھی اس اجتماع میں شامل ہوئے جنہیں نمایندہ بزم جناب شیخ محمد شفیع صاحب نے تحریکِ طلوعِ اسلام سے متعارف کرایا۔ اس تقریب میں خواتین بھی شریک تھیں۔ تقریب کا آغاز تلاوتِ قرآن کریم سے ہوا۔ جس کے بعد محترم مولانا عبدالرب صاحب نے جشنِ نزولِ قرآن سے متعلق ایک نہایت جامع تقریر فرمائی۔ جس سے سامعین کافی متاثر ہوئے۔ اس کے بعد کھانے کا اہتمام تھا جس کے دوران میں قرآنی حقائق سے متعلق تبادلۂ خیالات جاری رہا۔ اس موقع پر بزم کراچی نے شرکائے تقریب میں لٹریچر تقسیم کیا۔ اور شرکت کے لئے ان حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان سے درخواست کی کہ قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت اور نظامِ قرآنی کو عملاً متشکل کرنے میں بزم سے پورا پورا تعاون فرمائیں۔

تیسرا اجتماع دس مارچ کو منعقد ہوا جس میں طلوعِ اسلام کنونشن کے سالانہ اجتماع میں پیش کرنے کیلئے مناسب تجاویز پر

غور و خوض کیا گیا اور انہیں آخری صورت دے دی گئی۔ یہ تجاویز عنقریب ادارہ کو روانہ کر دی جائیں گی۔

بزم طلوعِ اسلام کراچی نے اس ماہ کراچی پولیٹیکنک انسٹی ٹیوٹ کے طلباء میں ایک صد کتابیں "اسباب زوال امت" اور پمفلٹ "الزامات" تقسیم کئے۔ انشاء اللہ آئندہ بھی اسکولوں اور کالجوں میں طلوعِ اسلام کے لٹریچر کی تقسیم منظم طریق پر جاری رہے گی۔

جشن نزولِ قرآن کی تقریب سعید پر مولانا عبدالرب صاحب نے جو تقریر فرمائی تھی وہ درج ذیل ہے:۔

مولانا عبدالرب صاحب کا خطاب

مہمانانِ گرامی قدر! السلام علیکم۔ بزم طلوعِ اسلام کراچی کی طرف سے نزولِ قرآن کے جشنِ عید کی اس مبارک تقریب پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ یہ عید کی رسم ہے کہ پہلے "سلام" کہا جائے اور پھر "عید مبارک"۔ "سلام" اور "مبارک" ہیں تو بامعنی الفاظ لیکن عام طور پر انہیں استعمال کیا جاتا ہے تو محض رسماً اور رسم کو مقصود حیات سے برائے نام تعلق ہوتا ہے۔ اگر یہ الفاظ علیٰ وجہ البصیرت زبان سے ادا ہوں تو ان میں وہ جادو بھرا ہے جو ملت کی کایا پلٹ دے۔ افراد کے کردار کو آسمان پر پہنچا دے اور بدنصیب ملت کو "خیر الامت" کا کھویا ہوا مقام واپس دلا دے۔

"السلام علیکم" کے معنی ہیں تم پر سلامتی ہو۔ تمہیں انسانیت کے اعلیٰ مدارج حاصل ہوں۔

تم سلامت رہو اور پھولو پھلو۔ خوبیوں کا بھلا سا نمونہ ہو۔ کتنی حسین آرزو ہے جس کے ساتھ تعاون کی بیدلی پیش کش بھی شامل ہے کہ طرفین ایک دوسرے کی انسانیت کی نشو و نما میں ممد و معاون ہوں گے۔ اگر اسلام کے یہ بلند تصورات سینوں میں مچلنے لگیں تو کیا رسمی علیک سلیک کی عادی سوسائٹی جنت نشان نہ بن جائے۔

بعینہٖ یہی صورت عید مبارک کی ہے۔ "عید مبارک" کا مفہوم و مقصود ہے دلوں میں کشاد اور فراخی کی فراوانی اور مستقل فراوانی۔ دلوں کی کشاد وہ جذب دروں ہے جس سے مسرت اور شادمانی کے چشمے ابلتے ہیں۔ اس کے برعکس دل کی گھٹن سے بیزاری، مایوسی اور ذہنی کوفت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ گلے مل کر مصافحہ کرنے والوں اور پھر عید مبارک کہنے والوں کے دلوں میں اگر کشاد اور شادمانی کے پُرخلوص جذبات موجزن ہوں تو یقیناً ہمارا معاشرہ "رحماء بینہم" کی جیتی جاگتی تصویر بن جائے۔

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ عید الفطر کی تقریب رمضان کے روزوں کے پورا ہونے کا جشن ہے۔ لیکن قرآن مجید اس عید کو روزوں کی بجائے اپنے نزول سے وابستہ کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس میں ارشاد ہوتا ہے کہ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَتْكُمْ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَشِفَاءٌ لِمَا فِي الصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ ۔ قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ۔ (۱۰/۵۷-۵۸)

ان آیات میں تمام انسانوں سے بلا امتیاز کہا گیا ہے کہ تمہیں تمہارے پروردگار کی طرف سے نصیحت نامہ اور دل کی بیماریوں کا نسخہ عطا کیا گیا ہے جو استعمال کرنے والوں کے لئے فائدہ رساں اور صحت بخش ہے۔ تمہیں چاہیے

کہ اللہ کے انعام واکرام پر خوشی کا اظہار کرو کیونکہ یہ نسخہ ہدایت ہر دولت سے بیش قیمت ہے" فبذلك فليفرحوا" اس (قرآن) کے ملنے پر خوشیاں مناؤ۔

نزول قرآن کا آغاز رمضان میں ہوا۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ "(پ۲)" اور یہ نزول لیلۃ القدر میں ہوا۔ "إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ" (۹۷) عید کی خوشی میں رمضان کے روزوں کا عمل دخل ضرور ہے لیکن اس خوشی کا حقیقی باعث قرآن کی انمول نعمت کا ملنا ہے۔ کسی نے اچھا کہا ہے۔

مرحبا مرحبا ماہ رمضان	لیلۃ القدر کے ماہ ذی شان
روزہ داروں نے ضبط نفس کیا	پا بزنجیر ہو گئے شیطان!
نوع انسان کی ہدایت کو !	لیلۃ القدر میں اترا قرآن
حکم فلیفرحوا ہے حکم خدا	سارے انسان منائیں خوشیاں
اس میں کچھ شک نہیں کہ عید الفطر	جشن ہے جشن نزول قرآن

غور طلب بات یہ ہے کہ وہ انعام اور وہ نسخہ ہدایت و رحمت ہے کیا جو قرآن نے انسانوں کو عطا فرمایا ہے۔ نسخہ کے اجزا تو بہت سے ہیں مگر مختصر سے وقت میں چند اجزاء کی نشاندہی ممکن ہو گی۔

۱۔ قرآن نے انسانوں کو سچی آزادی کا سبق سکھایا۔ "يَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ" (پ۹) وہ ان بوجھوں کو اتار دے گا جن کے تلے انسان دبے ہوئے تھے۔ اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ انسان کو آنکھ۔ کان۔ دماغ قدرت کی طرف سے بطور انعام ملے تھے لیکن ان کے آزادانہ استعمال کی مہلت اسے بہت ہی کم ملی۔ انسان نے انسان کو محکوم بنایا جسے موقع ملا اس نے اپنی مرضی اوروں پر ٹھونسی۔ کہیں غلامی کی زنجیریں اور کہیں عقیدت کے پھندے مگر سب سے بڑھ کر روٹی کی مجبوریوں کا سلسلہ ہے جو ٹوٹنے میں نہیں آتا۔

قرآن نے کہا! اے انسانو! اپنے مقام و منصب کو سمجھو۔ اور اس کی قدر و اہمیت کا احساس رکھتے ہوئے ایسا معاشرہ قائم کر دجس کی بنیاد احترام آدمیت ہو۔ سارے کام باہمی تعاون سے سرانجام پائیں اور اطاعت خالص قوانین خداوندی کی ہو۔ يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (پ۳۰) وہ دور جس میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر ادنیٰ اختیار حاصل نہ ہو اور حکم صرف اللہ کا چلے۔

قرآن نے مذہب کے گرفتار انسانوں کو بتایا کہ بے سوچے سمجھے رسوم کی ادائیگی اور اندھی تقلید مقام انسانیت کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ مذہب ہے "نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا" (پ۲۱) باپ دادا کی روش پر چلنا مذہب ہے جس میں عقل کو دخل نہیں۔ سربلندیاں چاہتے ہو تو دین اختیار کرو۔ جو ضابطۂ زندگی ہے جس کی ہر بات فکر و بصیرت پر مبنی ہے۔ اور جو اپنی دعوت فکر و بصیرت کی بنیاد پر پیش کرتا ہے۔ "أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي" ——— (پ۱۳)

میں اور میرے پیروکار اللہ کی طرف بصیرت کی رُو سے بلاتے ہیں۔

قرآن نے انسان سے کہا کہ ساری کائنات تیرے لئے مسخر ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا۔ (۱۳/۴۵) ہر شے قانون میں جکڑی ہوئی ہے جس سے وہ سرِ مو تجاوز نہیں کر سکتی۔ سنت اللہ کے خلاف ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا۔ اے انسان! تیرا کام ہے کہ قوانینِ فطرت، خواص اشیا، اور چیزوں کے رنگ ڈھنگ معلوم کر کے ان سے کام لے اور اپنی ساری نوع کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کر۔ قرآن نے انسان کے دل سے مادی قوتوں کا خوف دور کیا۔ اور اسے جرأت دلائی کہ قوائے فطرت سے مرعوب ہونے کی بجائے ان سے کام لینے کی فکر کرے۔

قرآن نے انسان کو زندگی کی اقدار دیں۔ ایسی قدریں جو زمان و مکان کی قید سے آزاد ہیں جو رہتی دنیا تک اٹل اور نہ بدلنے والی ہیں۔ مستقل اقدار نے زندگی کو توازن بخشا۔ ایسا توازن کہ ہر آن بدلتے ہوئے حالات و کوائف انسان کو ڈانواں ڈول نہ کر سکیں۔ تکریمِ انسانیت۔ قیامِ عدل۔ احسان۔ تعاون۔ انفاق۔ انسانی ذات کی نشوونما و استحکام سب قرآن کی عطا کردہ قدریں ہیں۔ انسان عبارت ہے جسم اور ذات سے۔ انسانی جسم کی پرورش کے طریقے تو سب بتلاتے ہیں۔ قرآن نے انسانی ذات کی نشوونما اور استحکام کے اصول بتائے۔ قرآن نے سمجھایا کہ جسم کی پرورش مٹی سے پیدا شدہ خوراک سے ہوتی ہے اور موت کے بعد جسم کھاد بن کر مٹی میں مل جاتا ہے اس لئے اپنی ساری ہمت جسم کی پرورش میں مت صرف کرو اور انسانی نفس یا ذات کی اہمیت کو بھی سمجھو۔ جو موت سے مرتی نہیں بلکہ موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اور بہتی ہوئی ندی کی طرح برابر آگے بڑھتی رہتی ہے۔ جسم کے آرام اور اس کی لذتیں موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں اور اگر ذات کی صحیح پرورش نہ کی ہو اور اسے مستحکم نہ بنایا ہو تو وہ آہستہ آہستہ ضعف و شکست کا شکار ہوتی جائے گی۔

قرآن نے بتایا کہ معاشرہ کی تشکیل انسان کا اپنا کام ہے تشکیلِ معاشرہ میں اللہ تعالیٰ بالکل دخل نہیں دیتا۔ انسان اپنے معاشرہ کو جنتی بھی بنا سکتا ہے اور جہنمی بھی۔ اور جہنمی معاشرہ کو جنتی معاشرہ میں تبدیل بھی کر سکتا ہے۔ جہنمی معاشرہ کو جنتی معاشرہ میں بدل دینے کا کام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والذین معہ نے کر کے دکھا دیا۔ اور اس تبدیلی کے طور طریقے واضح انداز سے قرآن میں محفوظ کر دیئے گئے۔ تاکہ جب اور جہاں معاشرہ میں تبدیلی کا خیال پیدا ہو انسان ان طور طریقوں سے کام لے کر اپنے مقصد کو حاصل کر سکیں۔

قرآن نے یہ بھی بتایا کہ سارے انسانوں بلکہ ہر جاندار کا رزق اللہ نے مہیا کیا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۔۔۔ (۶/۱۱) زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ نے نہ لی ہو۔ یہ اربابِ بست و کشاد کی ذمہ داری ہے۔ نیز ارشاد ہے وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ۔ (۲۵۱/۲) اگر اللہ بعض انسانوں کی مدد سے بعض انسانوں کو (ظلم سے) نہ روکتا تو روئے زمین میں فساد ہی فساد رونما ہوتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اربابِ بست و کشاد یعنی حکومت کو مفسدوں اور ظالموں کا خاطر خواہ انتظام کرنا چاہیئے۔ قرآنی نظامِ حیات کے بعض اجزاء کا

مختصر نشان دہی کے بعد یہ بتا دینا بے محل نہ ہو گا کہ اسلام کو بحیثیت دین یعنی بحیثیت نظام پیش کرنا۔

انسانی آزادی کی حدود و قیود واضح کرنا!

انسانی ذات کی نشو و نما کے قاعدے قانون بتانا

زندگی کی مستقل اقدار سمجھانا وغیرہ وغیرہ

زندگی کے وہ اہم مسائل ہیں جن کی تشریح و توضیح ادارہ طلوع اسلام بڑے دلکش اور اطمینان بخش انداز سے کر رہا ہے اور بزم ہائے طلوع اسلام ان قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت میں کوشاں ہیں۔ اس سلسلے میں بزم طلوع اسلام کراچی کے نمائندہ محترم شیخ محمد رفیع صاحب مقامی بزم کی ان مساعی جمیلہ کے بارے میں ضروری معلومات دے سکیں گے۔

لاہور۔ کنونشن کی آمد آمد کے سلسلے میں بزم کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ التزامی اجتماعات کے علاوہ ہنگامی اجتماعات بھی منعقد ہو رہے ہیں۔ انتظامات کے سلسلے میں سب کمیٹیاں بنا دی گئی ہیں۔ اراکین بڑے ہی خلوص اور انہماک سے اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں مصروف کار ہیں۔ اس مرتبہ جشن نزول قرآن کے سلسلے میں ۲۴۔ فروری (بروز اتوار) وائی۔ایم۔سی۔اے ہال میں جلسہ منعقد ہوا جس میں وقت سے پہلے ہی نشستیں پُر ہو گئیں۔ میاں عبدالخالق صاحب کے زیر صدارت تلاوت قرآن کریم اور محترم خلیل صاحب کی نظم اقبالؒ کے بعد محترم پرویز صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ قرآن کریم کی عظمت موضوع سخن تھا اور پرویز صاحب کا بیان محسوس ہو رہا تھا کہ ساری فضا حقائق و معارف قرآنیہ سے معمور ہے پوری تقریر نہایت جذب و شوق۔ اطمینان و سکون اور غور و خوض سے سنی گئی۔ بعد میں چند ایک سوالات بھی موصول ہوئے جن کے جواب بڑی وضاحت سے دیئے گئے۔ جلسہ کے دوسرے روز ۲۷ فروری کی شب محترم پرویز صاحب کے مکان پر دعوت خصوصی کا انتظام ہوا جس میں بہت سے اصحاب فکر و نظر اور احباب نے ذوق و شوق سے شرکت کی۔ یہ اجتماع خلوص و محبت اور سادگی کا بڑا ہی پر کیف تھا۔

لاہور چھاؤنی ہر اتوار کی شام کو باقاعدہ بزم کے اجلاس ہوتے رہتے ہیں۔ ہر اجلاس میں احباب مختلف موضوعات پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ۲۶۔ مارچ کو بزم کا ایک خصوصی اجلاس ہوا جس میں ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں رابطہ باہمی کے سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ اہم فیصلے کئے گئے۔

اس سلسلے میں بزم کے ارکان نے یہاں قرآنی فکر کے شیدائی محترم محمد یوسف ڈار صاحب اور دیگر ممتاز اصحاب سے پہلی بار رابطہ پیدا کیا۔ محترم محمد یوسف ڈار صاحب نے اراکین بزم کو اپنے ہر ممکن اور پُر خلوص تعاون کا یقین دلایا۔

چوہدری محمد صادق صاحب جو کوئٹہ کی بزم کے سرگرم رکن ہیں، پچھلے دنوں جب کوئٹہ سے یہاں تشریف لائے تو بزم کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ انہوں نے بزم کی لائبریری کے لئے کچھ لٹریچر بھی تحفتاً پیش کیا۔

بزم عنقریب ٹیپ پر محترم پرویز صاحب کے درس سنانے کا سلسلہ بھی شروع کر رہی ہے۔

بوریوالہ

بزم کے ہفتہ وار اجلاس باقاعدگی سے جاری ہیں۔ باہمی افہام وتفہیم سے بھی طلوع اسلام کی قرآنی فکر اور اس کے مسلک ومقصد کو ذہن نشین کرایا جا رہا ہے۔ اس سے مخالفین کے غلط پروپیگنڈے کے اثرات زائل ہو جاتے ہیں۔ اور بہت سی غلط فہمیوں کا پردہ چاک ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی "قائداعظم کا پاکستان" نامی پمفلٹ تقسیم کیا گیا۔ اور اس سے وہ بلند مقاصد نکھر کر عوام کے سامنے آگئے جن کی خاطر پاکستان کا حصول عمل میں آیا۔ ارکین بزم کنونشن کی تیاری میں مصروف ہیں۔

قصبہ کنجاہ ضلع گجرات میں نئی بزم کا قیام

کنجاہ

محترم محمد اسلم جاوید۔ حکیم علی حسین، محترم غلام حسین۔ محمد عظیم اور محمد خاں صاحبان کی کوششوں سے یہاں بزم طلوع اسلام کا قیام عمل میں آگیا ہے۔ احباب قرآنی فکر کی نشر واشاعت میں سرگرم عمل ہیں۔ ضروری لٹریچر کی تقسیم بھی ہو رہی ہے۔ حکیم علی حسین صاحب اتفاق رائے سے بزم کے نمایندے مقرر ہوئے ہیں۔ اور محترم اسلم جاوید صاحب اس کے سیکرٹری۔ بزم کا قیام عمل میں لاتے ہوئے اسلم جاوید صاحب نے اپنی اور اپنے رفقاء کی طرف سے اس مخلصانہ شدت آرزو کا اظہار اور دعا کی کہ خدا ان غریب اور بے سروسامان احباب کو اپنے قانون کی پوری پوری اطاعت اور اس کی اشاعت وتبلیغ کی توفیق عطا فرمائے۔

بزم کی توثیق کا اعلان

ادارہ طلوع اسلام، قصبہ کنجاہ میں قائم شدہ اس نئی بزم کے قیام کی باضابطہ توثیق کا اعلان کرتا ہے۔

ضرورتِ رشتہ

قرآنی فکر سے وابستگی کی بنا پر اہل حلقہ احباب سے مجھے اپنی دو عزیز بچیوں (عمر ۱۶، ۱۷ سال) کے لئے رشتہ درکار ہے۔ مالی بے چارگی کی وجہ سے ان بچیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دلا سکا۔ بڑی لڑکی درجہ سوم تک تعلیم حاصل کر چکی ہے اور چھوٹی لڑکی مڈل کے امتحان میں ہے۔ احباب حسب ذیل پتہ پر خط وکتابت کر لیں۔

عبدالغنی:۔ معرفت طلوع اسلام۔ گلبرگ لاہور

طلوعِ اسلام کنونشن

ضروری اعلان

طلوع اسلام کے سابقہ شمارے میں اعلان کیا گیا تھا کہ طلوع اسلام کنونشن امسال ۲۹-۳۰-۳۱ مارچ کو منعقد ہوگی لیکن بعض احباب اور بزموں کی طرف سے یہ کہا گیا کہ یہ تاریخیں موزوں ثابت نہیں ہوں گی۔ اس صورت حال کی روشنی میں مزید غور و خوض کے بعد کنونشن کے انعقاد کے لئے از سر نو

۱۲-۱۳-۱۴- اپریل سنہ ۱۹۶۳ء

کی تاریخیں مقرر ہوئی ہیں۔ تمام بزموں کو اس کی اطلاع بھیج دی گئی ہے اور اس کے ساتھ ضروری ہدایات بھی۔ کنونشن لاہور میں دفتر ادارہ کے قریب ہی منعقد ہو رہی ہے۔

ان ہدایات کے مطابق جو احباب کنونشن میں شریک ہوں گے ان کے داخلہ کی رقوم موصول ہونے پر شرکت کے لئے جو اجازت نامے بھیجے جاتے ہیں ان میں ضروری اور جواب طلب امور کی مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔ جو احباب کنونشن میں بحیثیت رضاکار شریک ہوتے ہیں انہیں بہر صورت ۱۱- اپریل (جمعرات) کی صبح تک لاہور پہنچ جانا چاہیئے۔

کنونشن کا مشروط پروگرام درج ذیل ہے:-

مشروط پروگرام:-

۱- جمعرات -	گیارہ اپریل -	شب -	(کنونشن کا خصوصی اجلاس)	تعارف
۲- جمعہ -	بارہ اپریل -	صبح -	کنونشن کا خصوصی اجلاس -	رپورٹیں اور استقبالیہ خطاب پرویز صاحب
۳- "	"	سہ پہر	کھلا اجلاس -	خطاب پرویز صاحب
۴- "	"	شب	کھلا اجلاس -	(متفرق تقاریر)
۵- ہفتہ -	۱۳- اپریل	صبح	کنونشن کا خصوصی اجلاس -	تجاویز
۶- "	"	سہ پہر	خواتین کا اجلاس (سامعین مخلوط ہوں گے اور تقاریر غیر خواتین کریں گی)	
۷- "	"	شب	کھلا اجلاس، مجلس استفسارات (زندگی سے متعلق عملی سوالات کا جواب قرآن کی روشنی میں)	
۸- اتوار -	۱۴- اپریل	صبح	کھلا اجلاس	خطاب پرویز صاحب
"	"	دوپہر	——— الوداع	